عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ

طلوعِ اسلام

دسمبر ۱۹۴۹

ایک روپیہ

پارٹیاں

کراچی میں چھوٹے اور بڑے سینکڑوں ہوٹل ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل بھی درجن بھر سے کم نہ ہوں گے۔ آپ کسی شام، کسی ہوٹل میں چلے جائیے، کسی نہ کسی کو پارٹی دی جارہی ہوگی۔ ظہرانہ، عصرانہ، عشائیہ۔ رقص و سرود اس کے علاوہ۔

یہ پارٹیاں بالعموم لیڈروں یا بننے والے لیڈروں کے اعزاز میں، متوقع مفاد کے حصول کے لئے تقریب کا کام دیتی ہیں۔ بعض لیڈر ایسے بھی ہیں جن کے اعزاز میں ہفتوں تک پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک ایک پارٹی میں پان پان سو مہمان۔ ہوٹل والے، دس پندرہ روپے فی کس کے حساب سے وصول کرتے ہیں۔ اس کے بدل میں جو کچھ وہاں سے ملتا ہے اس میں پچاس فی صدی چمک دمک، چالیس فی صدی بیماری اور دس فی صدی غذا ہوتی ہے۔ یہ اُس قوم کے مشغلے ہیں جس کے کروروں نفوس ایسے ہیں جنھیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ جس کی آبادی کا بیشتر حصہ منجمد کردینے والے جاڑوں میں سڑکوں پر سوتا ہے۔ جن کے لاکھوں گھرانے خستہ و خراب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جن کی ہزارہا بیٹیاں اور بہنیں ابھی تک غیر مسلم درندوں کے قبضے میں ہیں، جن کے یتیموں کا کوئی وارث نہیں، جن کی بیواؤں کا کوئی پرسانِ حال نہیں، جن کے بیماروں کو دوا میسر نہیں، جن کے مُردوں کو کفن تک نصیب نہیں، یہ جگمگ جگمگ کرنے والی پارٹیاں اسی قوم کے غم میں گھلنے والے لیڈروں کو دی جاتی ہیں۔ نہ پارٹیاں دینے والوں کو شرم آتی ہے، نہ انھیں قبول کرنے والوں کو حیا۔ یہ انسانی نظام کی وہ ناہمواریاں ہیں جنھیں قرآن فساد فی الارض کہکر پکارتا ہے اور جس کا فطری اور لازمی نتیجہ بربادی اور تباہی قرار دیتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قسم ہے بغداد اور روما الکبریٰ کے کھنڈرات کی! یہ کچھ قوموں اور سلطنتوں کے مٹنے کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے، ابھرنے کے وقت نہیں۔

نمائش!

محض نمائش

کراچی میں قائداعظم (مرحوم) کے مزار سے متصل قریب تیس ہزار انسانوں کی ایک بستی ہے جس کا نام انھوں نے اپنے محبوب قائد کی یاد میں، قائدآباد رکھا ہے۔ حالانکہ نہ وہ بستی ہے اور نہ آباد۔ بس تباہ حال، اور برباد انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو ایک کھلے میدان میں جمع ہو گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں جن سے نہ دھوپ رک سکتی ہے نہ سردی۔ زندگی غلاظت میں رینگتی پھرتی ہے یہ وہی جھونپڑیاں ہیں جو گذشتہ برسات میں سب کی سب خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی تھیں۔ ان سوختہ بخت انسانوں کو یہاں پڑے ہوئے دو برس سے اوپر ہونے کو آئے۔ نہ حکومت کی طرف سے اور نہ کسی جماعت کی طرف سے اتنا ہو سکا کہ ان بچاروں کے سروں پر سایہ ہی کا انتظام کر دے۔ جب کبھی کسی نے کوئی تجویز پیش کی، ہزار قسم کی معذرتیں پیش ہو گئیں۔

اب اسی میدان کے بقیہ حصہ میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس اور اقتصادی نمائش کا انعقاد ہو رہا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ دو تین ہفتہ کے اندر اندر یہ میدان سیمنٹ کی پختہ چار دیواری کے اندر، پختہ سٹالوں کا ایک طویل و عریض شہر بنا دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں اس پر چھ سات لاکھ روپیہ صرف آیا ہے۔ اس شہر میں بجلی بھی پہنچ گئی ہے۔ پانی کے نل بھی لگ گئے ہیں۔ پارک بھی بن رہے ہیں۔ تفریح کے عجیب وغریب سامان بھی جمع ہو رہے ہیں۔

قائداعظمؒ کے مزار کے ایک طرف اس طرح دولت وثروت کی نمائش ہو رہی ہے اور دوسری طرف نکبت وفلاکت اور تباہی وبربادی کی نمائش۔ یہ نمائش چند دن کی عارضی ہوگی اور وہ پہلی نمائش اسی طرح بدستور چلی جائے گی۔ اس نئی نمائش گاہ میں اُس قوم کی معاشی حالت سدھارنے کی تجاویز پر غور وفکر ہوگا جو دولت وثروت کی اس نمائش کے عین سامنے سکراتِ موت میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ کہنے والا اسی قسم کی نمائشوں کے داعیان کے متعلق کہہ گیا تھا کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام کراچی

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	مرتب
سالانہ دس روپے ششماہی چھ روپے	ایک روپیہ	محمد یونس

جلد ۲	دسمبر ۱۹۴۹ء	نمبر ۱۲

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پارٹیاں	۱	علم تفسیر (علامہ اسلم جیراجپوری)	۲۹-۵۴
نمائش	۲	کچھ اپنے متعلق	۵۵
لمعات	۳-۱۴	باب المراسلات (عذاب قبر)	۵۶-۶۸
اسلام اور روس (نظم) (محترم اسد ملتانی)	۱۵	نقد و نظر (۱) چراغ راہ کا قیادت نمبر (۲) نئے انتخابات پنجاب	۶۹-۸۰
عبادت (محترم پرویز صاحب)	۱۶-۲۵		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوعِ اسلام کے ایک بہی خواہ رقمطراز ہیں:

طلوعِ اسلام کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حال کی خرابیوں پر تنقید تو ہوتی ہے لیکن کوئی متبادل اسکیم سامنے نہیں رکھی جاتی۔ طلوعِ اسلام ہمارا محبوب ترین مجلہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کی مقبولیت میں فرق آئے۔ لہٰذا آپ اس طرف ضرور توجہ دیں۔

معلوم نہیں کہ طلوعِ اسلام کا کوئی نمائندہ آئینِ اسلامی کی تدوین میں مجلسِ دستور ساز میں بطور معاون شامل کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر طلوعِ اسلام کا نمائندہ اس مجلس میں شامل نہیں تو یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔

چونکہ اس خط میں طلوعِ اسلام کے مسلک یا لائحہ عمل کے متعلق ایک اصولی چیز کو سامنے لایا گیا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب نجی طور پر دینے کے بجائے، اسے طلوعِ اسلام کے صفحات ہی پر پیش کیا جائے تاکہ قارئین طلوعِ اسلام اس باب میں ہمارے موقف سے مطلع ہو جائیں۔

طلوعِ اسلام کے متعلق اکثر احباب کی طرف سے یہ شکایت یا مشورہ موصول ہوتا ہے کہ طلوعِ اسلام کوئی عملی کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کو ایک جماعت بنانی چاہیئے جو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لے اور جس مسلک کی طرف طلوعِ اسلام دعوت دیتا چلا آ رہا ہے اسے عملی طور پر قوم کے سامنے پیش کرے۔ اس باب میں ہم اشارۃً اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ اپنا مسلک واضح کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

ہماری قوم کس قدر جذبات پرست ہو چکی ہے اس کی طرف ہم نے "نقد و نظر" کے عنوان میں، جماعتِ اسلامی کے ترجمان، رسالہ چراغِ راہ کے قیادت نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے

توجہ دلائی ہے۔ اس کا اعادہ، اس مقام پر تحصیل حاصل ہے کیونکہ چند صفحات بعد وہ تصریحات خود بخود آپ کے سامنے آجائیں گی۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہماری ناکامیوں اور تباہ حالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بڑے جذباتی ہو چکے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور کوئی ایسا کام جس میں جذباتی تلاطم خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں ہماری فطرتِ سیماب آسا کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہم ایک مدت کی جذبات پرستی سے اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایک رقص ہو، ایک ہنگامہ ہو، ایک جوش ہو، ایک خروش ہو، لچھے دار تقریریں ہوں، فلک بوس نعرے ہوں، سیل انگیز جلوس ہوں، زلزلہ خیز ریزولیشن ہوں، بڑی بڑی انقلاب در آغوش اسکیمیں بنائی جائیں، آسمان اُلٹ دینے والے منشور (Manifesto) شائع کئے جائیں، تہلکہ مچا دینے والے عزائم و مقاصد کا اعلان کیا جائے، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو فریقِ مخالف کو گالیاں دیکر جیل خانہ ہو آئیں۔ بس اس کے بعد آپ کے باعمل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ یہی معراجِ مقاصد ہے۔ یہی منتہائے جہاد ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک پارٹی بنا کر کیا جائے۔ جماعت سازی اور گروہ بندی کے بغیر آپ باعمل ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی حرارت کا مقیاس ہی پارٹی بازی ہے۔

یہ ہے "عمل" کا وہ تصور جو ایک عرصہ سے قوم کے ذہن میں مرتسم کیا جا رہا ہے اور جس کے ذریعے قوم کے جذبات سے بری طرح کھیلا جا رہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ کی گذشتہ تاریخ سیاست میں کیسے کیسے دلفریب نعرے (Slogans) تھے جن سے قوم کے جذبات کو مشتعل کر کے اُسے آگ کے شعلوں میں جھونک اور خون کی ندیوں میں دھکیل دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس دوران میں آپ کی قوم نے کس قدر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ تمام قربانیاں کس بری طرح سے رائیگاں گئیں۔ کتنے افراد ہیں جو ان بے نتیجہ قربانیوں کے ہاتھوں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جو ان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بے معنی ہنگاموں سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں کتنے بچے ہیں جن کی نگہ پرداخت کرنیوالے ان تلاطم انگیز بے مقصد تحریکوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے اور ان کا آج کوئی والی اور وارث نہیں۔ کتنی بیوائیں ہیں جو آج انہی ہنگاموں کے صدقے اپنی چاک دامانی سے قوم کی غیرت و حمیت کا ماتم کر رہی ہیں۔ کتنے باپ ہیں جن کی زندگی کے سہارے یہی سیلاب انگیزیاں بہا کر، اور کتنی مائیں ہیں جن کی آنکھوں کا نور یہی برقی سامانیاں اچک کر لے گئیں۔ کتنے گھر ہیں جن کے چراغ انہی جھکڑوں نے بجھا دیئے اور کتنے در ہیں جنہیں یہی آندھیاں اکھیڑ کر لے گئیں۔ اور ان

تمام بربادیوں اور تباہیوں کا ماحصل؟ فضا میں چند الفاظ سے پیدا کردہ وقتی ارتعاش اور سینوں میں چند نعروں سے ابھارا ہوا عارضی تموج۔ سوچئے کہ آپ کی بے شمار تحریکوں اور لاتعداد جماعتوں کے "جہادِ زندگی" کا ماحصل اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ یہ تو یوں کہئے کہ قدرت کو ان چند کروڑ مسلمانوں کو بچانا مقصود تھا جو بساطِ سیاست کی آخری مہرہ بازی جناح جیسے ٹھنڈے دماغ کے ہاتھ لگ گئی جس نے اس مردِ آخر بیں کے فکرِ صحیح کو یوں متشکل کر دکھایا جس کی مغفرت کے لئے عالمگیر کی مسجد جامع کے مینارے شب و روز دست بدعا ہیں۔ ورنہ ہماری ہنگامہ خیز محفلوں کی یادگار آج سوائے خاکسترِ پروانہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتی۔

طلوعِ اسلام کو فطرت کی کرم گستری نے یہ سمجھنے کی توفیق ارزانی فرمادی کہ قوموں کے حالات ہنگامہ خیزیوں اور تموج انگیزیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی مستقل طور پر پیدا نہیں ہوسکتی جب تک ان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی نہ پیدا ہو، خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا۔ جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقع نہ ہوجائے، کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوسکتا جب تک اس میں تطہیرِ فکر و نظر نہ ہوجائے۔ انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے بے نقاب ہوگئی کہ فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی راہ بڑی صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں بڑی آہستہ خرامی اور نرم روی کی ضرورت ہے۔ اس میں سطح کی تلاطم انگیزیاں نہیں بلکہ عمیق دریا کی غیر محسوس روانیاں ہیں۔ پھر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ جذبات پرست قوم پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپکنے کی خوگر ہوتی ہے اور قلب و نظر کی تبدیلی کے آثار کہیں ایک دو نسلوں کے بعد جاکر سامنے آیا کرتے ہیں۔ یعنی، غالب کے الفاظ میں، عجلت پسند قوم کی تمنائے حصولِ مقاصد بے تاب اور دل کی دنیا کا عشق آسا انقلاب، صبر طلب ہوتا ہے۔ اس لئے ہنگاموں کی عادی قوم فکر و نظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو "عمل" میں شمار ہی نہیں کرتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق، شورش انگیز، ہنگامہ پرور "راہنمایانِ ملت" یہ الزام عائد کیا کرتے تھے کہ "اقبال ایک بے عمل شاعر ہے"۔ ان کے نزدیک عمل سے مفہوم انہی جیسی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ یہی لوگ قائداعظم (مرحوم) کے متعلق بھی یہی طعن دیا کرتے تھے کہ وہ عملی انسان نہیں۔ اور عمل سے ان کی مراد ہوتی تھی جیل خانہ کی یاترا کرنا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ "وہ" سراپا عمل

فصلی علیوں اپنی اپنی بولیاں سناکراڑ گئے اور باقی رہنے والے نتائج، اُنہی بے عمل انسانوں کے فکر و مساعی سے پیدا ہوئے۔

طلوعِ اسلام نے اپنے لئے قلب و نگاہ کی تبدیلی کی اسی دشوار گذار راہ کو تجویز و اختیار کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راہ کتنی لمبی اور اس کا سفر کس قدر حوصلہ آزما ہے۔ پیش پا افتادہ مفاد کی ایمان شکن جاذبیتیں بھی اس کے سامنے ہیں اور قدم قدم پر اسے دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ وہ ان مفادات کے سہل الحصول طریقوں کو بھی جانتا ہے اور ان کے غصب و نہب کی راہوں سے بھی واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لئے وہی مسلک تجویز کیا ہے جس میں نہ کوئی عاجلانہ لذت ہے نہ نگاہ فریب کشش۔ نہ فوراً مشتعل ہو جانے والے جذبات کی جھوٹی تسکین کا سامان ہے نہ راتوں رات انقلاب برپا کر دینے والی طفلانہ آرزوؤں کی فریب دہی کا کوئی نسخہ۔ اس کی راہ، ستاروں کی سی خاموش رعنائیوں کی کہکشاں ہے جو رات کی پرسکوت و مہیب تنہائیوں میں بے بانگِ رحیل و بے جرسِ کارواں، چپکے ہی چپکے طول و طویل منازل طے کرتی جاتی ہے، ھی حتٰی مطلع الفجر۔ وہ اپنے قارئین کی اس بے تابیٔ تمنا سے بھی خوب واقف ہے جو ایک طرف اس پر یقین رکھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کی دعوت، حق و صداقت کی دعوت ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ ما نیدِ اثر و اقتدار پروہ گروہ اور جماعتیں متمکن ہوئی جاتی ہیں جن کے پاس جذبات انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو اس سے ان کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے جو بعض اوقات ان خطوط کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے اقتباس سے لمعاتِ پیشِ نظر کی ابتدا ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کوئی متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو ان کی اس سے مراد کیا ہوتی ہے! طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء، فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غلط چیز کو ہٹانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی جگہ کونسی صحیح چیز رکھنی چاہیئے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام جب کبھی لاالٰہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی الا اللہ بھی پکارتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

لا و الا ساز و برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

اس لئے وہ تخریب بلا تعمیر کا نقشہ کس طرح سامنے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کے

جو بھی خواہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے ساتھ متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو متبادل اسکیم سے ان کی مراد ایسی اسکیم ہوتی ہے جو زمامِ اقتدار و اختیار کو غلط ہاتھوں سے فوراً چھین لے۔ اگر متبادل اسکیم سے ان کی یہی مراد ہے تو وہ معاف رکھیں! طلوعِ اسلام ایسی متبادل اسکیم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کو تو وہ پیش پا افتادہ مفاد کی چھین جھپٹ قرار دیتا ہے جس نے قوم کو اس درجہ سطحی جذبات کا پیکر اور ہماری تمام تحریکات کو بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ طلوعِ اسلام ایسی "متبادل اسکیم" چاہتا ہے جس سے قوم کی نگاہوں میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے کہ وہ زمامِ اقتدار و اختیار کسی غلط ہاتھ میں جانے ہی نہ دے۔ طلوعِ اسلام سے ایسی محکم اسکیم کی تمنا رکھئے، ویسی عاجلانہ اسکیم کی نہیں۔

"قلندریم و کرامات ما جہاں بینی است
زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی؟"

اور یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی حالانکہ اس کے لئے احباب کی "بنا بنائی تمنا" بار بار اصرار کر رہی ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر وہ آج جماعت سازی کی آواز بلند کر دے تو اس کی جماعت، کئی ایک موجودہ جماعتوں پر بھاری ہو جائے۔ لیکن وہ اس طریق جماعت سازی کے بھی خلاف ہے اور اسے محض عاجلانہ مفاد پرستی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہ جماعتیں کس طرح بنتی ہیں؟ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر ایک پارٹی کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں سے فریب خوردہ افراد، اس نئی آواز میں پناہ ڈھونڈتے اور جماعتِ اول سے اپنی فریب خوردگی کے انتقام کا سامان مضمر سمجھتے ہیں۔ لہذا ان کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں۔ یوں یہ جماعت وجود میں آجاتی ہے۔ اس کے بعد جماعتی عصبیت سے ان افراد میں سیمنٹ کا کام لیا جاتا ہے، یعنی ان کے دل میں اپنی جماعت کے برسرِ حق ہونے اور دوسری جماعتوں کے باطل پر اکٹھا ہونے کا ایمان کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ جماعتی عصبیت جسے قرآن کل حزب بما لدیھم فرحون کی عمیق نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ہر جماعت اس عقیدہ میں مگن ہوتی ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔ اس طرح باہمی نفرت سے قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہی وہ فرقہ پرستی اور جماعت سازی ہے

جسے قرآن کھلے لفظوں میں شرک[1] قرار دیتا ہے اور خدا کا عذاب کہکر پکارتا[2] ہے۔ پہلے زمانہ میں یہی گروہ بندی مذہبی فرقوں کے نام سے متعارف ہوتی تھی۔ اس دورِ سیاست میں یہ فرقہ بندی سیاسی جماعتوں کے پیرہن میں پائی جاتی ہے۔ روح وہی پرانی ہے، فقط نقاب نئے ہیں۔

کہا جائے گا کہ خود خدا بھی مسلمانوں کو حزب اللہ (خدا کی جماعت) قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہر جماعت شرک کا مظہر اور عذابِ خداوندی کا پیکر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ خدا ملتِ اسلامیہ کو غیر مسلموں کے مقابلہ میں حزب اللہ کہتا ہے اور دوسروں کو حزب الشیطان۔ یعنی حزب اللہ پوری کی پوری ملت ہے نہ کہ ملت کے اندر ایک گروہ، حزب اللہ کا اور دوسرا گروہ حزب الشیطان کا۔

پھر یہ کہا جائے گا کہ آج جس حالت میں مسلمان ہے جب انھیں اس حالت سے نکال کر صحیح اسلامی حالت تک لے جایا جائے گا تو اس کے لئے بہرحال کسی نہ کسی جماعت کی ضرورت ہوگی۔ جماعتی رنگ کے بغیر آپ کام کیسے کریں گے؟ سو پہلے تو یہ دیکھ لیجئے کہ قرآن نے جب فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک اور عذابِ خداوندی قرار دیا ہے تو اس میں ایسے حالات میں بھی کسی استثنیٰ کا ذکر نہیں۔ اس کے بعد پھر وہی چیز سامنے آئے گی کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کیسے کیا جائے؟ تو سوال یہ ہے کہ کیا جماعت سازی کے بغیر اصلاح کے کام کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی؟ کیا طلوعِ اسلام نے اپنی ہندوستان کی چار سالہ زندگی اور پھر اس کے بعد پاکستان کی نشأۃِ ثانیہ میں جماعت سازی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا؟ ضرورت ہے صرف کام کرنے والوں کی۔ یہ رفقائے کار اپنے اندر، تقسیمِ عمل کے طریق پر، نظم و ضبط پیدا کریں گے اور ایک طے کردہ پروگرام کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیں گے۔

---

[1] ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (۳۰/۳۱) مسلمانو! دیکھنا کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر سے) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین میں پارٹیاں (فرقے) بنالیں اور پھر خود بھی ایک پارٹی بن گئے۔ اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر پارٹی گمن ہو کر بیٹھ گئی کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔

[2] قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم بأس بعض (۶/۶۵) کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا تمہیں پارٹیوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم ایک دوسرے سے لڑائی کا مزہ چکھو۔

ان کی دعوت یہ نہیں ہو گی کہ ہماری "جماعت" میں شامل ہو جاؤ۔ یا اپنے آپ کو کسی پارٹی کے ساتھ منسوب کئے بغیر مسلمانوں کے فکر و نظر میں تبدیلی کی کوشش کریں گے۔ یہ انھیں مذہب کے غلط تصور کی بجائے، دین کا صحیح تصور دیں گے۔ ان کی حیثیت معلمین کی ہو گی نہ کہ کسی پارٹی کے داعیان کی۔ اس وقت بھی حلقہ طلوعِ اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طلوعِ اسلام کی پیش کردہ تعلیم کو اپنے اپنے دائرہ عمل و اثر میں نہایت خاموشی سے پھیلاتے رہتے ہیں اور دوسرے تو ایک طرف، خود ادارۂ طلوعِ اسلام کو بھی ان کی اس تبلیغ و تنشیر کا علم نہیں ہوتا۔ وہ کسی جماعت کے رکن نہیں، کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ اپنے دائرہ میں رجعت الی القرآن کی اس دعوت کو عام کرتے رہتے ہیں جس کا نقیب طلوعِ اسلام ہے۔ طلوعِ اسلام کو اپنے ان خاموش، گمنام اور غیر متعارف، مبلغین پر ناز ہے کہ اس کا مقصود اس قسم کے لوگ پیدا کرنا ہے جو ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہٹ کر چپکے ہی چپکے دوسروں کے قلب و نگاہ میں وہی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان کی نگاہ میں پیدا ہو چکی ہے۔ انہی غیر متعارف مبلغین میں سے اکثر ادارۂ طلوعِ اسلام کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھتے ہیں۔ وہ ادارہ سے ان مشکلات کا حل دریافت کرتے ہیں جو انھیں اپنی اس تبلیغ کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ وہ ان استفسارات کا جواب پوچھتے ہیں جو ان سے دورانِ تبلیغ میں کئے جاتے ہیں اور جن کے جواب میں انھیں دقت پیش آتی ہے۔ وہ اپنے مشوروں سے ادارہ کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح قرآن کے طالب علموں کا یہ ایک خاموش سا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حلقہ کا کوئی نام نہیں، یہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ ان کے سامنے کوئی پیش یا افتادہ مفاد نہیں۔ یہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ وہ جس ذہنی اور قلبی انقلاب کے لئے کوشاں ہیں اس کے سوا ملت کے مرضِ کہن کا کچھ اور چارہ نہیں۔ اس وقت اس انقلاب کے کوئی محسوس اور نمایاں آثار ان کے سامنے نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پوری عمر اس جدوجہد میں صرف کر دیں اور یہ انقلاب محسوس صورت میں ان کے سامنے نتیجہ خیز نہ ہو۔ لیکن وہ اس کے باوجود نہایت استقلال و استقامت سے اپنی کوششوں میں منہمک ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی بنیادی تبدیلیاں ایک دن میں رونما نہیں ہو جایا کرتیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کے متعلق، اور تو اور خود ذات رسالتمآب ؐ سے کہدیا گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے محسوس نتائج حضورؐ کی زندگی میں رونما ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حضورؐ کے بعد ظہور پذیر ہوں۔ اس لئے کہ اس جدوجہد میں کسی ایک فرد یا

افراد کی اپنی زندگی کا سوال ہی نہیں۔ سوال تو پوری کی پوری قوم میں انقلاب پیدا کرنے کا ہے۔ اور اس کے بعد تمام نوعِ انسانی میں انقلاب پیدا کرنے کا۔ یہ ایک نسل کی جدوجہد میں پیدا ہو جائے یا اس کے لئے دس نسلوں کی مسلسل جدوجہد کی ضرورت پیش آئے۔ مدت کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ اگر اسی قسم کے انقلاب کی کوشش سو سال پہلے شروع ہوتی تو آج جو کچھ ہم دیکھنا چاہتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ اگر یہ کوشش اس سے پہلے شروع نہیں ہوئی تو اسے آج شروع کر دینا چاہئے تاکہ آج نہیں، تو کل کسی نہ کسی وقت یہ انقلاب ظہور پذیر ہو جائے۔ لیکن اگر آپ مدت کی طوالت سے گھبرا کر، پھر عاجلانہ طریقِ کار کی طرف لپک پڑے تو یہ انقلاب پھر ویسے کا ویسا رہ جائے گا۔ یہ عاجلانہ طریقِ کار، سر درد کے لئے اسپرین کی ٹکیہ ہے۔ سر درد ایک منٹ میں غائب ہو جائے گا لیکن جب اسپرین کا اثر زائل ہو گا تو پھر پہلے سے بھی دگنی شدت اور نزاکت کے ساتھ ابھرے گا۔ اور اگر آپ اسے ہر بار اسی طرح اسپرین کے عاجلانہ علاج سے دباتے رہے تو ممکن ہے ایک دن آپ کو درد کی جگہ سر سے ہی جواب مل جائے۔ مسلمان جذبات پرستی کی اسپرین سے علاج کا خوگر ہو رہا ہے، یہ عاجلانہ فائدہ چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں سر درد غائب ہو جائے۔ لیکن ایک طبیب حاذق کی نگاہ عاجلانہ فائدہ پر نہیں بلکہ مزمن مرض کی علت کی اصلاح پر ہوتی ہے۔ اور یہ اصلاح وقت بھی چاہتی ہے اور علاج میں استقامت بھی۔ اس میں ایک سر درد کے علاوہ اور دردِ سری بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن جب آرام آئے گا تو ہمیشہ کے لئے مرض جاتا رہے گا۔ طلوعِ اسلام، اسپرین کی ٹکیہ نہیں دیتا۔ یہ اسی حاذقانہ انداز سے علاج کرنا چاہتا ہے جس طریق سے اس سے پہلے ایک مرتبہ علاج ہو چکا ہے اور اس علاج کے نتائج دنیا دیکھ چکی ہے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

یہ ہے طلوعِ اسلام کا مقصود و منتہی اور یہ ہے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا طریقِ کار۔ جو اس طریقِ کار کی افادیت اور خیریتِ انجام پر یقین رکھتا ہے وہ اس کا ساتھ دے۔ لیکن جو اسی جدوجہد کو کامیاب تصور کرے جس میں عاجلانہ مفاد کو سمیٹا جا سکے، اسے کوئی اور ساتھی تلاش کرنا چاہئے کہ اس کے لئے اس طریقِ کار میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں۔ ومن یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق (۲/۲۰۰)۔ "جو شخص محض پیش پا افتادہ فوری مفاد چاہتا ہے تو اسے وہ مفاد تو مل جاتے ہیں۔ نؤتہ منہا۔ (۳/۱۴۴) لیکن اس کا مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا"۔ اب یہ

آپ کے اختیار میں ہے کہ ان دونوں راہوں میں سے جونسی راہ پسند کریں اپنے لئے تجویز کرلیں طلوعِ اسلام اپنے لئے ایک راہ تجویز کرچکا ہے اور اسے اس راہ کے صراطِ مستقیم ہونے پر یقین ہے۔

کہدیا جائے گا کہ آپ قلب ونگاہ کی تبدیلی کی فکر کرتے رہئے اور اتنے میں بے زمام قوتیں ایسا استحکام حاصل کرجائیں گی کہ پھران کے پاؤں اکھیڑنا ممکن نہیں رہے گا۔ لیکن یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ نہ ہم جناب صاحب ضرب کلیمؑ اور حضور نبی اکرمؐ سے بڑھ کر داعیٔ انقلاب ہیں اور نہ ہی یہ سرکش قوتیں، فرعون اور ابوجہل سے زیادہ محکم گیر ہیں۔ حضرت موسیٰؑ چالیس برس تک قوم کے قلب ونگاہ کی صحیح تربیت میں مصروف تگ وتاز رہے اور بنی اسرائیل ارضِ موعود پر ان کی وفات کے بعد قدم رکھ سکے۔ حضور نبی اکرمؐ کامل تیرہ برس تک نہایت سکون واستقامت سے اپنے پیغام کی خاموش تبلیغ میں منہمک رہے اور اس دوران میں سرکش قوی کی طرف سے آپ صعوبات کو بڑی ہمت اور استقلال سے برداشت کرتے رہے۔ جب انھیں بھی بیج سے کھیتی پکنے تک کا عرصہ انتظار میں گذارنا پڑا تو ہم کس طرح دانہ بونے ہی فصل کاٹ سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات اس بیتابیٔ تمنا یا مفادِ عاجلہ کے مظاہر ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ جمہور کی نگاہ کی تبدیلی سے اتنا بڑا تند وتیز سیلاب اٹھا کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی زمین گیر قوتیں اس کے سامنے خس وخاشاک کی طرح بہ جایا کرتی ہیں۔ سرکش قوتوں کی یہ محکمیت اسی وقت تک عمیق وشدید دکھائی دیتی ہے جب تک ہم میں ناپختگی ہے۔ داعیانِ انقلاب کے قلب ونگاہ کی پختگی اور محکمی کے آگے یہ قوتیں پرِکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہٰذا صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ نہایت استقامت اور سکون سے قلب ونگاہ کی تبدیلی کے لئے سعیٔ پیہم میں مصروف رہئے اور جب یہ تبدیلی پختگی تک پہنچ جائے تو باطل کی قوتوں کو ایک ہی جھٹکے سے الگ کردیجئے۔

بانشۂ درویشی، درساز ودمادم زن
چوں پختہ شوی خودرا برسلطنتِ جم زن

یہ ہے طلوعِ اسلام کا مسلک وطریقِ کار۔ اگر آپ میں اس سے زیادہ کام کرنے کی ہمت ہے تو ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ اور وہ قدم یہ ہے کہ تمام کام چھوڑ کر ملک کے طول وعرض میں درسگاہوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیجئے جن میں ابتداء سے انتہا تک اس نہج کی تعلیم دی جائے جس کی تبلیغ طلوعِ اسلام کے صفحات پر ہوتی ہے، یعنی خالص قرآن کی روشنی میں تمام علومِ جدیدہ کی تعلیم۔ اگر آپ نے یہ کردیا تو تبدیلیٔ قلب ونگاہ کا وہ عرصہ جس کی درازی آپ کو شبِ ہجر کی طرح ڈرا رہی ہے، سمٹ کر بیس پچیس سال میں ختم ہوجائیگا۔ جونہی آپ کے بچوں کا پہلا گروہ ان درسگاہوں سے

فارغ ہو کر نکلا، ساری زمین پر چلتا پھرتا انقلاب نظر آجائے گا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس خطۂ ارض کی تقدیر کس طرح سے بدل جاتی ہے۔ اگر قوم میں سرسید مرحوم کی سی ہمت والے لوگ موجود ہیں تو وہ کسی ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سارے ملک میں اس قسم کی آزاد درسگاہوں کا جال بچھا دیں۔ طلوعِ اسلام اس باب میں ہر ممکن خدمت کے لئے تیار ہے۔ بچوں کو ان درسگاہوں میں بھیجئے اور خود دفاعِ پاکستان کے لئے ہر وقت تیار رہئے۔ اگر آپ نے ہمت کر کے اس خطۂ زمین کو بیس پچیس سال تک اغیار کی نظرِ بد سے بچا لیا اور اُدھر درسگاہوں سے وہ شاہیں بچے نئے بال و پر لیکر نکل آئے تو پھر آپ آسمان سے سینہ تان کر کہہ سکیں گے کہ

دیدۂ آغازم! انجامم نگر!!

اور اگر آپ یہ نہیں کرنا چاہتے تو پھر ان مقدس مداریوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہئے جو اپنے جھولے میں سب کچھ رکھنے کے دعویدار بھی ہیں اور رات کی روٹی کے لئے آپ کی بھیک کے محتاج بھی۔

اب رہا ہمارے بھائی کے سوال کا دوسرا حصہ یعنی یہ کہ مجلس دستور ساز میں تدوینِ آئین اسلامی کے لئے طلوعِ اسلام کا نمائندہ بھی ہے یا نہیں۔ سو اس ضمن میں عرض ہے کہ طلوعِ اسلام کا کوئی نمائندہ اس مجلس میں نہیں اور نہ ہی طلوعِ اسلام اس قسم کی نمائندگی کو کسی صورت میں مفید ہی سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اگر موجودہ حالات میں شرعی نظام مدون بھی ہو گیا تو وہ اسی شریعت کا نظام ہو گا جسے صدیوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں شریعتِ حقہ کے نام سے مرتسم کیا جا رہا ہے اور جس میں قرآن کے علاوہ اور سب کچھ ہو گا، اس لئے کہ اربابِ اقتدار ہمیشہ جمہور کی رائے کا ساتھ دینے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اگر انھوں نے شرعی نظام کو نافذ ہی کرنا ہو گا تو وہ اس میں کوئی شق ایسی نہیں رکھیں گے جسے جمہور اپنے موجودہ عقیدوں کے مطابق شریعت کے مطابق نہ سمجھتے ہوں۔ اندریں حالات، جس نظامِ اسلامی کا مدعی طلوعِ اسلام ہے اسے بحالاتِ موجودہ کون گوارا کر سکے گا۔ یہ تو اسی صورت میں نافذ ہو سکے گا جب پہلے قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ لوگ قرآنی نظام ہی کو شرعی نظام قرار دیں اور اس کے علاوہ کسی نظام کو شرعی نہ سمجھیں خواہ اس کی نسبت کیسے ہی بلند مقام کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ مسلمان کے لئے قرآن ابھی بڑا غریب (اجنبی) ہے۔ اسے قرآن سے مانوس کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی دعوت کو عام کرنے والے جرائد و مبلغین کام کرنے کیلئے نکل آئیں اور ملک میں ایسی درسگاہیں قائم ہو جائیں جن میں یہی تعلیم دی جائے۔ اس کے سوا کشادِ کار کی کوئی اور راہ ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔

اگر آپ کی سمجھ میں اس سے بہتر راہ کوئی اور آسکتی ہو تو ارشاد فرمائیے، ہم ہر وقت اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

ایک خوشخبری محترم پرویز صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ "اسباب زوالِ امت" پر طلوع اسلام کے لئے مقالہ سپردِ قلم فرمائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم آپ کا یہ حقیقت کشا اور بصیرت افروز مقالہ، جنوری ۱۹۶۰ء کے پرچہ میں شائع کر سکیں گے۔ یہی مقالہ، اس بحث میں محاکمہ کا کام بھی دیگا اور اس سے اس سلسلہ کو ختم کر دیا جائے گا۔

معراج انسانیت جلد ساز کے ہاں پہنچ چکی ہے۔ صرف فہرست اور مقدمہ کی ابتدائی کاپیاں پریس میں ہیں۔ جن احباب کی طرف سے قیمت موصول ہو چکی ہے ان کی خدمت میں سب سے پہلے کتاب روانہ کی جائے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ جس وقت یہ پرچہ آپ تک پہنچے گا اس وقت تک کتاب کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ اگر اس میں کچھ تاخیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوجئے۔ آپ کی رقم کی وصولی کا اطلاعی کارڈ آپ کو بھیجا جا رہا ہے۔

"معراج انسانیت" کی قیمت فی جلد بیس روپیہ ہے اور خرچ ڈاک اور پیکنگ وغیرہ اڑھائی روپیہ۔ اگر آپ بذریعہ ریل منگانا چاہتے ہیں تو بیس روپے بھیجئے۔ کرایہ آپ کو خود ادا کرنا ہوگا۔ مکمل سیٹ (چاروں جلد) کی قیمت پچپن ۵۵ روپے ہے۔

قیمت کی رقم بذریعہ کراس چیک اس نام پر بھیجئے۔

J. B. Arif,
Manager, Talu-e-Islam.

پتہ وہی — رابسن روڈ۔ کراچی — وی۔پی طلب نہ فرمائیے۔

اسلام اور روس

قوسِ قزح

غافل نگاہ غور سے قوسِ قزح کو دیکھ — قدرت کی ایک رمز پہ رنگیں نظارہ ہے
بھٹکی شعاعِ نور، رہِ مستقیم سے — رنگوں کا اختلاف جبھی آشکارہ ہے

اُمَّۃً وَّسَطًا

مشرق ہے آج سرخ تو مغرب بنفشئی — یہ اس طرف کی حد، وہ اُدھر کا کنارہ ہے
ہے درمیاں میں گنبدِ خضرا کا سبز رنگ — کیا خوب اُمَّۃً وَّسَطًا کا اشارہ ہے

اعتدال

کہتا ہے رنگ سبز کہ از روئے اعتدال — اسلام دردِ مشرق و مغرب کا چارہ ہے
سمجھو کہ اعتدال کے مرکز سے ہٹ گئے — جمعیت اہلِ دیں کی اگر پارہ پارہ ہے

روسی نشان

دیکھو درانتی اور ہتھوڑے کی شکلِ خاص — کیا صاف صاف نقلِ ہلال و ستارہ ہے
لینن کی بھی نگاہ تھی اسلام کی طرف — روسی نشان کا اسی جانب اشارہ ہے

اسدؔ ملتانی

معراجِ انسانیت

یعنی معارف القرآن (پرویز) کی چوتھی جلد، جو تذکار جلیلہ حضور سرورِ کائناتؐ پر مشتمل ہے، کی جلد بندی ہو رہی ہے۔ کتاب، دسمبر کے شروع میں بھیجنی شروع کر دی جائے گی۔ اگر آپ نے ابھی تک اپنی فرمائش نہیں بھیجی تو بہت جلد بھیجئے۔ تفصیل کے لئے لمعات کی آخری سطور ملاحظہ فرمائیے۔

ایجنسی کے لئے شرائط دریافت کیجئے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
رابسن روڈ۔ کراچی

عبادت

پرویز

[یوں تو محترم پرویز صاحب کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جس سے متعلق یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ قارئین کی گہری توجہ کا مستحق ہے لیکن پیش نظر مضمون خصوصیت سے اس قابل ہے کہ قارئین کرام اسے امعان نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ عبادت کے تحت نہایت اہم مباحث سے متعلق اشارات آ گئے ہیں اور ان پر نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قانون کیا ہے؟ خدا اور بندے کی رفاقت سے کیا مفہوم ہے؟ فطرت اللہ سے کیا مراد ہے؟ صبغۃ اللہ کسے کہتے ہیں؟ وغیرہ ذلک۔

اس مختصر سے مضمون میں ان مباحث سے متعلق محض اشارات پر اکتفا کی گئی ہے۔ ان پر تفصیلی بحث معارف القرآن کی کسی آئندہ جلد میں ہوگی۔ ہم دست بدعا ہیں کہ محترم پرویز صاحب بہت جلد ان مباحث سے متعلق جلد کو مکمل کر کے تشنگانِ علم دین کی سیرابی کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ طلوع اسلام]

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی۔ شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب۔ گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سے دو اور دو سے تین پر جا پہنچی۔ میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہن انسانی میں بھی کچھ ایسے تدریجاً اور غیر شعوری طور پر رونما ہوتے ہیں کہ جب تک ان کا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا یہ محسوس ہی ہوتے نہیں پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آ رہا ہے۔ ذہنی انقلاب کے یہ تخریبی اور تعمیری مراحل دریا کی پرسکوت روانیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتداءً نقوش برآب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں وہی ایک عرصہ کے بعد ایک محکم حصارِ سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں۔ تاریخ انسانیت میں اس قسم کے غیر محسوس اور غیر مرئی تغیر و تبدل کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آ سکتی ہیں۔ لیکن جو انقلاب اسلام کے متعلق مسلمانوں کے ذہن میں رونما ہوا ہے شاید ہی اس کی نظیر کہیں مل سکے۔ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک مکمل نظام حیات تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ایک عالمگیر دولتی نظام

(A Universal System of Science) تھا۔ لیکن وہ اپنے اس صحیح اور بلند ترین مقام سے آہستہ آہستہ، غیر محسوس طور پر، سرکتے سرکتے ایک دہرم (Religion) کی شکل اختیار کر گیا — تاریخ انسانیت کا یہ ایک ایسا تحیر انگیز انقلاب ہے جس پر ہر دیدۂ عبرت خونفشاں اور ہر قلب حساس طلسم پیچ و تاب بن کر رہ جاتا ہے۔ جب اسلام کا مقابلہ مذاہب عالم (یعنی دنیا کے دھرموں) کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی اسے ہندومت، بدھ مت، جین مت، عیسائیت، یہودیت، زرتشیت وغیرہ مروجہ مذاہب (دھرم) کے سامنے لایا جاتا ہے تو دیدۂ بینا میں ایک خفیف سی ہنسی پھیل جاتی ہے کہ کیا چیز کیا بن کر رہ گئی ہے۔

انقلابات ہیں زمانے کے

اسلام، دھرم (باصطلاح عوام مذہب) نہیں اس لئے مختلف دھرموں سے اس کا تقابل و توازن کیا؟ یہ ایک نظامِ زندگی ہے۔ یا سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ نظامِ حکومت[1] ہے اس لئے اس کا مقابلہ کیا جائے گا ان نظامہائے حکومت سے جو ذہنِ انسانی نے آج تک وضع کئے ہیں اور یوں بتایا جائے گا کہ نظامِ آسمانی، زمین کے نظامہائے حکومت سے کس طرح فائق اور برتر ہے۔ اسلام ایک دین ہے، نظامِ اطاعت ہے، دھرم نہیں ہے۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں اطاعت کے مختلف نظام، یعنی حکومت کے مختلف انداز و طرق جو انسانوں نے وضع کئے ہیں لائے جائیں گے۔ یا مختلف آئینی نظامِ اجتماعیہ مثلاً سوشلزم، نازی ازم، فاشی ازم، کیپٹل ازم (سرمایہ داری وغیرہ) کے ساتھ اسلام کے نظامِ اجتماعیہ کا موازنہ کیا جائے گا اور یوں ثابت کیا جائے گا کہ اسلام کس طرح فطرتِ انسانی کے مطابق نظامِ اجتماعیہ یا نظامِ حکومت ہے۔ اسلام کو ایک دھرم (باصطلاح عوام مذہب) تسلیم کرنے سے اسلام اپنے صحیح مقام سے گر کر کسی اور مقام میں جا پہنچتا ہے اور جب اس کے متعلق نگاہ میں ایک مرتبہ یہ بنیادی فرق پیدا ہو گیا تو اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جائے گا وہ اس نئے مقام سے متعلق ہوگا۔ اس لئے اصلی مقام سے اس کا کچھ واسطہ نہ ہوگا۔ اسلام کے متعلق مسلمانوں کی نگاہوں میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کس طرح پیدا ہو گئی؟ یہ ایک داستان ہے بڑی دلخراش اور ایک حدیثِ الم ہے بڑی جانگداز۔ اس کیلئے تیرہ سو سال کی، مسلمانوں کی نہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ پر گہری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ گہری اس لئے کہ یہ تبدیلی اسی طرح غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر واقع ہوئی ہے جیسے گھڑی کے گھنٹے کی سوئی غیر محسوس

---

[1] اسلام درحقیقت انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے نظام کا نام ہے لیکن چونکہ آجکل حیاتِ اجتماعیہ کی تعبیر نظامِ حکومت سے ہی کی جاتی ہے، اس لئے ہم نے اسے نظامِ حکومت سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ اسلام کا نظام زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔

طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا پہنچتی ہے۔ یہ تبدیلی کس طرح ہوئی، سردست اس کو چھوڑیئے دیکھئے صرف یہ کہ تبدیلی ہوئی اور ایسی محکم بنیادوں پر ہوئی کہ آج ہم میں یہ احساس بھی نہیں رہا کہ اسلام دھرم نہیں تھا۔ کچھ اور تھا!

دھرم سے مفہوم یہ ہے کہ انسان پرستش، یعنی پوجا پاٹ کیلئے کسی شے (Object) کو تجویز کرتا ہے۔ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، پرستش کی رسوم وضع کرتا ہے۔ یہ پرستش کی شے کوئی پتھر ہو یا مظاہرِ فطرت میں سے کوئی چیز۔ اجرامِ سماوی ہوں یا کوئی دوسرا انسان۔ فرشتے ہوں یا خدا۔ کچھ بھی ہو اور کوئی بھی ہو۔ انسان اور اس کے درمیان تعلق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس کیلئے پرستش کی چیز (Object of Worship) ہوتا ہے اور یہ اس کا پرستار یعنی پوجنے والا (Worshipper)۔ جب اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیا، پوجا کی رسومات ادا کر دیں، تو اس کا اور اس کا تعلق ختم ہو گیا۔ باقی رہی دنیائے معاملات، تو اس کے لئے اخلاقیات کی چند چیزیں ہیں جو عام طور پر ہر جگہ مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرامکاری سے بچو، کسی کو دکھ نہ دو، وغیرہ۔ وہ ہے خدا پرستی اور یہ ہے نیک عملی۔ اس کا نام ہے دھرم اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے تمام دھرم برابر ہیں۔ اور چونکہ اسلام کو بھی ایک دھرم خیال کر لیا جاتا ہے اس لئے انسان اس فریب کا شکار ہو جاتا ہے کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک دھرموں کا تعلق ہے تمام دھرم یکساں ہیں لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام دھرم نہیں ہے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام سمیت تمام مذاہب (دھرم) یکساں ہیں۔

اسلام میں خدا پوجا پاٹ کی شے (Object of Worship) نہیں بلکہ حاکمِ اعلیٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان پرستار اور پرستیدہ کا تعلق نہیں بلکہ حاکم اور محکوم کا تعلق ہے۔ دین کے مفہوم خدا کی پرستش نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت کا عملی اقرار ہے۔ یہاں نیک عملی سے مقصود ایک **ضابطۂ اخلاق** کی پیروی نہیں جو ہر جگہ یکساں ہے حتیٰ کہ جو لوگ خدا کی ہستی کے منکر ہیں ان کے ہاں بھی وہی ضابطۂ اخلاق موجود ہے۔ اسلام میں نیک عملی سے مراد اس **ضابطۂ قانون** کی اطاعت ہے جو خدا کی حکومت کا دستورِ اساسی ہے۔ اسلام کا تقابل ضوابطِ اخلاق سے نہیں بلکہ دنیا کے ضوابطِ قوانین دوسرے سے ہوگا۔ نظامِ حکومت اور آئینِ سلطنت سے ہوگا، اخلاقی ضابطہ تو اس ہمہ گیر ضابطۂ قانون کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظامِ حکومت (دین) اور دنیا کے دیگر نظامہائے حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یہاں اصولاً قانون سازی کا اختیار کسی کو نہیں، یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان اس قانون کو نافذ کرنے کیلئے ہیں۔ یہ ہے وہ امتیازی خصوصیت جو کسی اور نظامِ حکومت کو حاصل نہیں۔

جب کسی تعلیم کے اصول و بدیہات کا مفہوم بدل جائے تو ان کے متعلقات کا مفہوم خود بخود بدل جاتا ہے۔ جب اسلام، دین سے بدل کر دہرم ہو گیا تو اس کی اصطلاحات کے معانی میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب خدا کا تصور ایک حاکم مطلق کا تھا تو اس کی **عبادت** سے مفہوم اس کی **محکومیت** تھی۔ جب وہ ایک پوجا کی چیز (Object of Worship) بن گیا تو عبادت کے معنی بھی پوجا اور پرستش کے رہ گئے۔ آج اگر کسی کے متعلق کہا جائے کہ وہ بڑا عبادت گذار ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے فوراً آنکھوں کے سامنے اس قسم کا نقشہ آجاتا ہے کہ وہ خدا کی بڑی پرستش کرتا ہے، نوافل پڑھتا ہے، تسبیح پھیرتا ہے، زاہد شب زندہ دار ہے، صائم الدہر ہے، ایک گوشے میں بیٹھا ذکر و فکر میں مستغرق رہتا ہے۔ یعنی دہرم میں جتنی چیزیں بھگتی کی تھیں ان سب پر کاربند ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ وہ محکوم کس کا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ (عبادت) کا مفہوم بدلنے سے کس طرح سارے کا سارا نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اوجھل ہی نہیں ہوا بلکہ ایک دوسرے نظام میں بدل گیا جو اصل نظام سے یکسر مختلف تھا۔ حالانکہ لفظ **عبادت** کے معنی محکومیت ہیں، پوجا اور پرستش نہیں۔ عبد کے معنی ہیں غلام، بندہ، محکوم۔ جب حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ہارونؑ) نے فرعون کو ایمان کی دعوت دی ہے تو اس نے اور اس کے ارباب حل و عقد نے یہ کہہ کر اس دعوت کو مسترد کیا تھا، بلکہ اس کا استخفاف کیا تھا کہ ہم اس قوم کے نمایندوں کی دعوت کو کیسے قبول کریں جو خود ہماری محکوم ہے۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳/۴۷)

انھوں نے کہا کیا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔

یعنی دعوتِ ایمان دینے والے آدمی بالکل ہماری طرح کے انسان ہیں (فوق البشر دکھائی نہیں دیتے) اور اس قوم کے فرد ہیں جو ہماری محکوم ہے[1]۔ یہاں **عابد** کے معنی واضح ہیں۔ اسی داستان کے دوسرے ٹکڑے میں ہے کہ فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ "تم بھی بڑے احسان ناشناس اور مروت فراموش ہو۔ میں نے تم پر اور تمہاری قوم پر اس قدر احسانات کئے ہیں اور تم ان احسانوں کا بدلہ یہ دے رہے ہو؟" حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! میں آپ کے ان احسانات سے خوب واقف ہوں۔ یہ احسانات ایسے ہی ہیں جیسے ایک قصاب بکری کو گھاس اور دانہ دیکر اس کی پرورش کا احسان جتائے۔

---

[1] کتنی بڑی حقیقت ہے۔ محکوم قوم لاکھ صداقتوں کی حامل ہو، کوئی اس کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کا محکوم ہونا ہی ہزار عیب کا ایک عیب ہے۔
غلامی کیا ہے! ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی۔ جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ (۲۶/۲۲)

کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان دھر رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے!

عَبَّدْتَّ کے معنی واضح ہیں۔ یعنی تو نے انھیں اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ لہٰذا عبد اور عابد کے معنی ہیں محکوم اور معبود کے معنی ہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اور عبادت کے معنی ہیں محکومیت۔ فارسی میں عبد کے معنی بندہ اور عبادت کے معنی بندگی، اپنا مفہوم ادا کر سکتے تھے۔ لیکن یہی **بندگی** ہندوستان میں آکر پوجا اور پرستش بن کے رہ گئی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر صرف تعظیم اور ڈنڈوت کے معنی میں استعمال ہونے لگ گئی۔ اب بندگی کے معنی پرستش سے زیادہ کچھ نہیں۔ محکومیت کا تصور نہ لفظ عبادت کے اندر رہ گیا ہے نہ بندگی کے اندر۔ سورۂ کہف میں انسانوں کو یہ حکم دیا کہ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰) (انسان کو چاہئے کہ) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اور اسی سورۃ کے شروع میں خدا نے خود اپنے متعلق فرمایا کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یعنی إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰) حکومت صرف اللہ کیلئے ہے۔ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ (۱۲/۴۰) اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوائے کسی اور کی محکومیت نہ اختیار کی جائے۔

ان مقامات سے **عبادت** کے معانی بالکل صاف طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔ "خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو" یعنی اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ اس لئے کہ "حکومت صرف اللہ کے لئے ہے" اور اسی کا حکم ہے کہ "اس کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو" یہی قرآن کریم کی دعوت ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۲۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے اُس رب کی محکومیت اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انھیں بھی جو تم سے پہلے ہو گذرے۔ تاکہ تم تقویٰ[1] شعار ہو جاؤ۔

اور یہ دعوت کوئی نئی دعوت اور یہ پکار کوئی انوکھی پکار نہیں۔ بلکہ شروع سے سلسلۂ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہی دعوت اور یہی صدائے ربانی رہی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت کو تسلیم نہ کرو۔ یہ انسانیت کی انتہائی ذلت ہے کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کا محکوم ہو جائے۔ محکوم اس کا ہونا چاہئے جو اپنے سے بلند و بالا ہو۔ اور انسان سے بلند صرف خدا کی ذات ہے ہر رسولؑ کا یہی پیغام اور ہر نبیؑ کی یہی تعلیم تھی اس لئے کہ یہ پیغام، پیغامِ خداوندی اور یہ تعلیم، تعلیمِ ایزدی تھی۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا،

---

[1] تقویٰ کے صحیح مفہوم کیلئے کسی دوسری فرصت کا انتظار فرمائیے۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱/۲)

کہ اللہ کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔

یہی حضرت ہودؑ نے فرمایا:

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۱۱/۵۰)

کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (حاکم) نہیں۔

انہی الفاظ میں حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو پیغام خداوندی پہنچایا (۱۱/۶۱) یہی حضرت شعیبؑ نے فرمایا (۱۱/۸۴) حضرت یوسفؑ نے قیدخانہ کی چار دیواری میں جو وعظ فرمایا وہ خدا اور بندے کے اسی تعلق کو واضح کرنے کیلئے تھا۔ انھوں نے اپنے ساتھی قیدیوں سے پوچھا کہ کہو ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹) کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا اچھا ہے یا اللہ کا جو یگانہ ہے اور سب پر غالب ہے؟ اس کے بعد فرمایا کہ تم لوگوں نے جن کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے انھیں درحقیقت انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم بنانے کا کوئی حق نہیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ جیسے تھیٹر کے تماشے میں کسی کا نام بادشاہ رکھ لیا جاتا ہے کسی کا نام وزیر۔ حالانکہ وہ فی الحقیقت بادشاہ یا وزیر نہیں ہوتے۔ یاد رکھو

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔

اس کے بعد جو کچھ فرمایا اس سے عبادت کا مفہوم بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (۱۲/۴۰)

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو

ان دونوں ٹکڑوں کو پھر ملا دیجئے یعنی (۱) حکومت صرف اللہ کیلئے ہے اور (۲) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو (تعبدوا)۔ ظاہر ہے کہ عبادت سے مفہوم محکومیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۱۲/۴۰) یہی محکم اور متوازن نظام اطاعت (دین) ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰) لیکن (مشکل یہ ہے کہ) بہت سے لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں، وہ نہیں جانتے کہ انسانوں کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کریں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہ تھیٹر کے ایکٹر کو سچ مچ کا بادشاہ سمجھ لیتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں، خوف کھاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ چیز محض لاعلمی پر مبنی ہے۔ (لَا یَعْلَمُوْنَ) علم آ جانے کے بعد یعنی اپنی حقیقت اور دوسرے انسانوں کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد جو نہیں سکتا

کہ انسان خدا کے سوا اور کسی کی حکومت کو جائز تسلیم کرلے۔ وحدتِ خلق کا وہ عظیم الشان نظریہ جسے قرآن کریم نے اس بلند آہنگی سے پیش کیا ہے اور جس کی تصدیق و تائید آج علمِ انسانی کے انکشافات بدلائل و براہین کر رہے ہیں اسی حقیقتِ عظمیٰ کا آئینہ دار ہے کہ انسان میں اخوت و مساوات کا تعلق ہے، حاکم اور محکوم کا رشتہ نہیں۔ حکومت غالب کی ہو سکتی ہے اور غالب (قہار) صرف خدا کی ذات ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ نوامیسِ فطرت ہے۔ اسلئے ان چیزوں کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ اور انسان سب برابر ہیں۔ برابر والے کی محکومیت اس کی اور اپنی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بس ایک خدا کی ہستی باقی رہ جاتی ہے جو انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور غالب و بالادست ہے۔ محکومیت اسی کی جائز اور بجا ہو سکتی ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

عبادت یعنی محکومیت کے متعلق تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام اسی ایک حقیقت کو بار بار دہراتے رہے۔ اور یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کا مکمل اور آخری اعلان حضور سرورِ کائنات صلعم کی وساطت سے تمام نوعِ انسانی میں کیا گیا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۔ (۱۷/۲۳)

اور تیرے رب نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبدیت اختیار نہ کرو۔

خدا کی حکومت کو چھوڑ کر عام انسانوں کی محکومیت تو ایک طرف، قرآن کریم نے انتہائی شکل کو سامنے لاکر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اور تو اور کسی رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ انسانوں کو اپنا محکوم بنالے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے (محکوم) ہو جاؤ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تم ربانی ہو جاؤ۔ اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا ضابطۂ قوانین رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچایا اور رسولوں کو ان قوانین کے نافذ کرنے کی قوت بھی عطا فرمائی تاکہ وہ عملاً خدا کی حکومت کو دنیا میں رائج کر کے دکھا دیں یہی ان حضرات علیہم السلام کا منصب تھا۔ اس لئے عام انسان تو ایک طرف، ان حضرات انبیاء عظامؑ کیلئے بھی یہ سزاوار نہ تھا کہ وہ خدا کی محکومیت کے بجائے لوگوں کو اپنے احکام کا مطیع و فرماں پذیر بنائیں۔

ان کی دعوت یہی تھی کہ سب لوگ خدا کے محکوم بن جائیں اور خدا کی محکومیت کا ذریعہ وہ ضابطۂ قوانین (کتاب) ہے جو اس نے بغرض اطاعت نازل فرمائی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ) اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے تین آیتوں کے بعد فرمایا کہ

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نظامِ اطاعت (دین) چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام تلاش کر لیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اسی کے قانون کے فرمانبردار ہیں اور (تقاریر کی سب گردشیں) اسی (قانون سرمدی) کی طرف رُخ کئے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ نظامِ حکومتِ الٰہیہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ ہی کے ضابطۂ قوانین کے تابع اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے۔ کوئی شے نہ اس کی محکومیت سے سرتابی کر سکتی ہے نہ کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کر سکتی ہے۔ جب کائنات کی ہر شے کی یہی فطرت اور یہی آئین ہے تو پھر انسان کے لئے کوئی اور آئینِ حکومت اور نظامِ اطاعت (دین) کیوں ہو؟ اگر انسان کوئی دوسرا نظام اختیار کریں گے تو اس غیر فطری نظامِ زندگی کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ کے میزان میں ان کی یہ روشِ زندگی ناقابلِ قبول ہوگی۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۵)

اور جو کوئی اسلام (نظامِ حکومتِ خداوندی) کے علاوہ کسی اور نظامِ اطاعت (دین) کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

خدا کی اطاعت و محکومیت کے علاوہ کوئی بھی نظامِ اطاعت و حکومت ہو، سب غیر فطری اور غیر اسلامی ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ایسے نظام کا نام **طاغوتی نظام** یعنی غیر اللہ کا نظام ہے۔ جو خدا کی حکومت سے سرکشی اختیار کر کے کوئی اور نظامِ اطاعت و حکومت قائم کرے وہی **طاغوت** ہے۔ اسلئے حکومتِ خداوندی کا اقرار اور ہر طاغوتی نظامِ اطاعت کا انکار دینِ فطرت ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

اور جس نے طاغوت کی اطاعت سے منہ پھیر لیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے بلاشبہ محکم شاخ کو پکڑ لیا، جو ٹوٹ نہیں سکتی۔

یہ خدا کا اقرار اور غیر خدا کا انکار ہے۔ اس اقرار اور انکار کی تشریح دوسرے مقام پر اس طرح ملتی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کے نظامِ حکومت کے مرکز (اللہ اور رسول) کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اس مرکز نے صاحبِ اختیار بنائے ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان صاحبانِ اختیار میں اختلاف پیدا ہو جائے تو چاہیے کہ مرکزِ نظامِ خداوندی کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔

یعنی خدا اور آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدائی نظام کی اطاعت اختیار کرو اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات کے رفع کرنے کیلئے اسی مرکزِ اطاعت و تسلیم کی طرف رجوع کرو۔ خدا پر ایمان لانے سے خدا اور بندے کے درمیان یہی تعلق پیدا ہونا چاہیے۔ یعنی حاکم اور محکوم کا تعلق نہ یہ کہ خدا کو ایک پرستش کی شے (Object of Worship) سمجھ کر اس کی پوجا کر لی اور اپنے معاملات میں غیر خدائی نظام کی طرف رجوع کیا۔ یہ تو خدا کے بجائے طاغوت پر ایمان کے مرادف ہے جس سے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آیتِ مندرجہ صدر سے اگلی آیت میں فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ (۴/۶۰)

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن (عملاً یہ حالت ہے) کہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات میں فیصلہ غیر خدائی نظام (یعنی طاغوت) سے کرائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ طاغوت سے انکار کریں اور (اصل یہ ہے) کہ سرکش نظام چاہتا ہے کہ انہیں اس طرح بہکا دے کہ راہِ راست سے بہت دور جا پڑیں۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ پر ایمان اور طاغوت سے انکار کے معنی کیا ہیں؟ خدا کے قانون سے فیصلے طلب کرنا، یہ ہے خدا پر ایمان۔ اور اس کی عبودیت، اور غیر خدا سے معاملات کے تصفیے کرانا، یہ ہے طاغوت پر ایمان، اس کی محکومیت۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خدائی قانون کی محکومیت کے صراطِ مستقیم سے گمراہ کر کے تحاکم الی الطاغوت

(غیر خدائی نظام کی محکومیت) کے غلط راستہ پر لے جائے۔ ایسا غلط راستہ جس پر چلنے سے تم راستہ سے بہت دور جا پڑو۔ یعنی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد (Diametrically Opposite) ہیں۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تم طاغوتی نظام اختیار کرو، اس لئے کہ یہ خود شیطان (یعنی قانونِ فطرت سے سرکشی کرنے والوں) کا نظام ہے اور خدائی نظام کے مخالف۔ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ۔ (۲/۱۶۹) شیطان تمہیں غیر متوازن نظام اور فواحش کا حکم دیتا ہے اس کے برعکس اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (۷/۲۸) یقیناً اللہ فواحش کا حکم کبھی نہیں دیتا۔ بلکہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ..... وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (۱۶/۹۰) یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں عدل و احسان[1] کا حکم دیتا ہے اور فواحش و منکر سے روکتا ہے۔ یعنی اللہ جس بات کا حکم دیتا ہے "شیطان" اس سے روکتا ہے اور جس بات سے اللہ روکتا ہے "شیطان" اسے اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ خدا اور "شیطان" کے نظام ایک دوسرے سے متخاصم اور ان کے فیصلے ایک دوسرے سے متضاد و متخالف ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے جہاں خدا کی عبادت (محکومیت) کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی "شیطان" کی عبادت (محکومیت) سے منع کیا ہے۔

اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ (۳۶/۶۰-۶۱)

اے نوعِ انسانی! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرنا یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ صرف میری ہی عبودیت اختیار کرنا، یہی صراطِ مستقیم ہے؟

یہاں "عبادت" کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اگر (لَا تَعْبُدُ الشَّیْطٰنَ) کے معنی یہ لئے جائیں کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا تو اس سے مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کون ہے جو شیطان کی پرستش (Worship) کرتا ہے؟ شیطانی (یعنی غیر خدائی) احکام مانے جاتے ہیں، طاغوتی نظام کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے لیکن شیطان کی پرستش تو کہیں نہیں ہوتی۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے خوف کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں، لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہئے کہ وہ بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اسی لئے شیطان کو شیطان نہیں کہتے بلکہ اس کا نام "ملک طاؤس"[2]

---

[1] عدل اور احسان کے صحیح مفہوم کے لئے بھی کسی دوسری فرصت کا انتظار فرمائیے۔

[2] ایک انگریز (خاتون) مصنفہ نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے اس نام سے ایک دلچسپ کتاب شائع کی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے۔ اس سے ڈرتے بہت ہیں۔ اس مقام پر "شیطان" سے مراد (Devil) ہے۔ لیکن قرآن میں شیطانی نظام کی محکومیت سے منع کرتا ہے وہ انسانوں کا خود ساختہ ہر خدائی نظام ہے جس میں قانونِ فطرت سے سرکشی اختیار کی جاتی ہے۔

رکھ چھوڑا ہے۔ یہ غالباً شیطان کے حضرت آدمؑ کو بہکانے کی روایت کی طرف تلمیح ہے۔ بہرحال مقصد یہ تھا کہ شیطان کی پرستش (پوجا) کوئی نہیں کرتا اس لئے لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کی اطاعت نہ کرو۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (۲/۱۶۸) شیطان کے نقشِ قدم کی اطاعت نہ کرو۔ لہٰذا عبادت کے معنی اطاعت و محکومیت کے ہیں۔

عبادت کے قرآنی مفہوم کو پیش نظر رکھئے اور پھر اس آیۂ جلیلہ پر غور فرمائیے کہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶)

اور میں نے جن اور انس کو صرف اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یعنی جن و انس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی "عبادت" کریں (جن کسے کہتے ہیں؟ اس کے لئے معارف القرآن جلد دوم ملاحظہ فرمائیے) اگر (لیعبدون) کے معنی پوجا اور پرستش کے لئے جائیں تو ارشادِ خداوندی کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو چاہئے کہ ہر وقت خدا کی پرستش کرتا رہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔ انسان ہر وقت خدا کی پرستش کیسے کر سکتا ہے؟ پرستش تو کچھ وقت کے لئے ہوگی باقی اوقات میں انسان کو دوسرے کام بھی کرنے ہوں گے ہمارے ہاں "خدا کی پرستش" کی شکل **نماز** ہی قرار دی جائے گی۔ سو یہ بھی واضح ہے کہ نماز بھی شب و روز میں پانچ مرتبہ ہی پڑھی جاتی ہے۔ ہر وقت نماز پڑھتے رہنے کا حکم نہیں۔ اس لئے (لیعبدون) کے معنی پرستش کرنے کے نہیں بلکہ اطاعت و محکومیت اختیار کرنے کے ہیں۔ یعنی اس آیۂ مقدسہ سے مفہوم یہ ہے کہ تخلیقِ انسانی سے مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ اپنی زندگی خدائی نظامِ حکومت کے ماتحت بسر کرے کہ یہی نظام اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ باقی تمام نظام غیر فطری ہیں۔ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) کا وہی مفہوم ہے جو سورۂ یٰسین کی ان آیات میں مذکور ہے جو پہلے بھی درج کی جا چکی ہیں۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۳۶/۶۰-۶۱)

اے بنی آدم کیا میں نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لے رکھا کہ تم شیطان کی محکومیت اختیار نہ کرنا، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اور صرف میری ہی عبادت کرنا یہی صراطِ مستقیم ہے؟

اس مقام تک یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش کا نہیں خدا کی حاکمیت کے اقرار اور عملی اعتراف کا ہے۔ خدا کی حاکمیت سے کیا مقصود ہے اور اس حاکمیت کا

عملی اعتراف کس طرح ہوتا ہے، ان عنوانات پر میرے اکثر مضامین میں شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے جن کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ مختصر الفاظ میں "خدا کی حکومت" سے مقصود یہ ہے کہ ہر زمانہ کے انسان، اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل، ان محکم اصولوں کی روشنی میں متعین کریں جو بطور مستقل اقدار، قرآن کی دفتین میں مذکور و محفوظ ہیں اور اس طرح ارض (معاشی اور اجتماعی نظام) کو سمار (مستقل اقدارِ کائنات) سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتے جائیں۔

یہاں ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے: "حاکم اور محکوم" کے تعلق سے ہمارا ذہن آقا اور غلام کے سے تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ آقا اور غلام کا تعلق یہ ہوتا ہے کہ آقا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حکم دیئے چلا جاتا ہے، اور غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرتا چلا جائے۔ چنانچہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا بھی جاتا ہے کہ وہ ہمارا آقا ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں۔ جو لوگ احکامِ اسلامی (یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) کی پابندی کرتے ہیں ان سے پوچھئے تو وہ کہدیں گے کہ یہ خدا کا حکم ہے اس لئے ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ احکام مقصود بالذات ہیں۔ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "پرستش" میں "عبادات" مقصود بالذات بن جاتی ہیں۔ مثلاً جس شخص نے ان شرائط و حدود کے مطابق جو اس کیلئے متعین کی گئی ہیں، نماز ادا کر لی وہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا تھا وہ ادا ہو گیا۔ اسے اس سے مطلب نہیں کہ اس نماز پڑھنے سے کچھ حاصل ہوا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک نماز پڑھنا آقا کا حکم تھا جس کی تعمیل غلام کا فرض ہے۔ غلام کو اس سے واسطہ نہیں کہ اس حکم کی تعمیل کو غائت کیا تھی اور اس کا مقصود کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا کہ میں نے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر دی۔ مالک مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی جواب ہمارے ہاں کے "عبادت گذار بندوں" کی طرف سے ملتا ہے۔ جب ذرا زیادہ کرید کر پوچھئے تو کہدیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ملتا ہے۔ اور جب پوچھئے کہ ثواب سے کیا حاصل ہوتا ہے تو کہدیا جاتا ہے کہ اس سے "نجات" مل جاتی ہے۔ انھیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ثواب کسے کہتے ہیں اور نجات سے کیا مفہوم ہوتا ہے۔ آپ نے بھی ہزار مرتبہ ثواب کا لفظ سنا ہوگا اور خود بھی بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ اس سے آپ کی مراد کیا ہوتی ہے؟ اور تو اور، اگر آپ سے کوئی کہدے کہ صاحب! ثواب کا لفظ عربی زبان کا ہے۔ اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ استعمال کر دیجئے تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے کہ ثواب سے مفہوم کیا ہے۔ تو آپ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں استعمال کر سکیں گے۔ ایک لفظ میں نہیں، ایک فقرہ میں بھی آپ اس کا مفہوم نہیں سمجھا سکیں گے، اس لئے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم خود آپ کے ذہن میں بھی نہیں۔ ثواب کسے کہتے ہیں؟ "نجات" سے مفہوم کیا ہے؟ ان امور کیلئے بھی کسی دوسری فرصت کا انتظار فرمائیے (اس لئے کہ یہ گوشے عنوانِ زیرِ نظر سے باہر ہیں اور بجائے خویش مستقل عنوانات، جن پر ضمنی طور پر گفتگو

نہیں کی جا سکتی) اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ جب دین کا صحیح تصور سامنے ہو تو دین کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن جب دین، مذہب سے بدل جائے تو پھر یہ اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک نکتہ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائیگی کہ اس باب میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ دنیائے فکر و عقیدہ میں کہیں اور نہیں ملتا۔ یعنی اسلام نے خدا اور بندہ کے تعلق کا جو تصور دیا ہے وہ دیگر تصورات سے یکسر الگ اور ارفع و اعلیٰ ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ وہ تصور ان دو الفاظ میں سمٹا ہوا ملے گا جو نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک پر وفات کے وقت آخری الفاظ تھے "ھو الرفیق الاعلیٰ" یعنی خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے لیکن ایسی رفاقت جس میں خدا کی حیثیت رفیقِ اعلیٰ کی ہے اور انسان کی حیثیت رفیقِ ادنیٰ کی۔ لیکن تعلق بہرحال رفاقت کا ہے۔ سارا قرآن اسی تعلق کی تفسیر ہے۔ اب غور کیجئے کہ کیا خدا اور انسان کا یہ تعلق آپ کو کہیں اور بھی ملتا ہے؟ دنیائے افکار اور جہانِ عقائد، دونوں میں نگاہ دوڑا کر دیکھئے۔ یہ تصور آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

رفاقت سے مقصود کیا ہے؟ اس تعلق کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس سے نتائج کیا مرتب ہوں گے؟ ان تفاصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ (یہ تمام امور معارف القرآن کی پانچویں جلد میں سامنے آجائیں گے، جن کا پہلا باب اس سوال کا جواب ہوگا کہ "اسلام کیا ہے اور وہ کونسی ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی") اس وقت صرف چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام نظام کائنات ایک خاص نظم و ضبط سے چل رہا ہے اور ایک متعینہ منزل کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے۔ اس میں ہر آن، حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ حق اور باطل، قرآن کی دو عظیم القدر اصطلاحیں ہیں جن کا صحیح مفہوم تفصیلاً سمجھ میں آسکتا ہے، اجمالاً صرف اتنا سمجھئے کہ حق پروگرام کے مثبت (Positive) پہلو کا نام ہوتا ہے جس کا نتیجہ تعمیر ہوتا ہے اور باطل اس کے منفی (Negative) پہلو کو کہتے ہیں جس کا مآل تخریب ہوتا ہے۔ ہر تعمیر کے لئے ایک تخریب ضروری ہوتی ہے۔ جب تک دانہ میں منفیانہ حیثیت سے تخریب نہیں واقعہ ہو جاتی، پودہ اپنی مثبت حیثیت سے وجود میں نہیں آسکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں منفی اور مثبت پہلوؤں کی یہ کشمکش ہر آن جاری ہے لیکن قانون یہ ہے کہ مثبت پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ تعمیری پہلو کے اسی غلبہ سے کائنات میں ارتقاء (Evolutions) کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ قانون کیا ہے جس سے کائنات میں تعمیری پہلو اس طرح غالب رہتے ہوئے ہر شے کو نشوونما

دیئے جا رہے ہیں! قرآن میں غور کرنے سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ کائنات میں جو حادثہ واقعہ ہوتا ہے اس کے ردِ عمل[1] (Re-Action) کیلئے ایک خاص صفتِ خداوندی (Aspect of Reality) ظہور میں آتی ہے۔ اس طرح مختلف حوادث کے لئے مختلف شئونِ الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے لیکن ایک خاص حادثہ کے لئے جس قسم کی صفت (شان) کا ظہور ایک مرتبہ ہوتا ہے، اس قسم کے حادثہ کیلئے ہر مرتبہ اسی قسم کی صفت کا ظہور ہوتا ہے اس التزام اور استمرار کو سنت اللہ کہتے ہیں۔ اس کا نام قانونِ الٰہیہ ہے جس کا وہ حصہ جو ہمارے حیطۂ ادراک میں آجاتا ہے قانونِ فطرت کہلاتا ہے اور جو حصہ ماورائے فطرت یعنی عالمِ امر سے متعلق ہے، قانونِ مشیت کہلاتا ہے۔

یہ کچھ عالمِ آفاق (نظامِ فطرت) میں ہو رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اپنا تمدنی نظام بھی اسی نہج و اسلوب سے چلانا چاہئے جس انداز و طریق پر نظامِ فطرت چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوتا ہے تو انسانی طبائع، اس پر ایک خاص انداز سے (Re-Act) کرتی ہیں، یہ ردِ عمل (Re-Action) چونکہ مبنی ہوتا ہے ذاتی مصالح و منافع پر، اس لئے مختلف انسانوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ یا انسانوں کے ایک ہی گروہ کا مختلف مواقع پر ردِ عمل مختلف۔ قرآن کی رو سے اس کا نتیجہ فساد فی الارض (تمدنی زندگی میں ناہمواری) ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح نظامِ فطرت میں ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک خاص قسم کا ردِ عمل ہوتا ہے اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا) اسی طرح تمہارے اجتماعی نظام میں بھی ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہونا چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ردِ عمل کس قسم کا ہونا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے کہ نظامِ فطرت میں ایک حادثہ پر جس قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہوتا ہے، انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں اسی قسم کے حادثہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور انسانوں کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لو کہ فطرت اللہ کے مطابق ہوا۔ یعنی انسانی فطرتِ صحیحہ کے مطابق۔ اس لئے کہ فطرت اللہ پر ہی انسانی فطرت کو مفترع کیا گیا ہے۔ (فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا)۔ اور جب یہ ردِ عمل پورے التزام اور استمرار سے ظہور میں آنے لگ گیا تو سمجھ لو کہ تم میں صفاتِ خداوندی منعکس ہو گئیں۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "خدا کے رنگ

---

[1] ردِ عمل کا لفظ محض سمجھانے کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ اسے اس مفہوم میں نہ لیجئے جس میں یہ انسانی جذبات کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جذبات کا ردِ عمل اور مفہوم رکھتا ہے۔ خدائی ردِ عمل سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات کے حوادث سے صحیح نتائج مرتب کرنے کیلئے، خدا کی کونسی قدرت (صفت) ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اقبال اسے (Behaviour of Reality) سے تعبیر کرتا ہے۔

میں رنگے جاتا ہے۔ (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ)۔

اب دیکھئے کہ کائنات کے ایک حصہ (نظام طبعی) میں خاص حوادث و وقائع پر خاص شئون الٰہیہ (صفاتِ خداوندی) ظہور میں آرہی ہیں۔ جس سے حق (تعمیری پہلوؤں) کے غلبہ سے کائنات اپنے مقصود و منتہیٰ کی طرف چلے جاتی ہے۔ اس کے دوسرے حصہ (یعنی انسانی نظام تمدن و معیشت) میں اسی قسم کی صفات کا ظہور (بشریت کے اندر) انسان کی طرف سے ہورہا ہے جس سے انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، اپنے منزل مقصود کی طرف بلند ہوتی جارہی ہے۔ یہ ہے خدا اور بندے کی رفاقت۔ اس میں خدا رفیقِ اعلیٰ ہے، کیونکہ مستقل قانون (سنت اللہ یا فطرت اللہ) اسی کا ہے۔ انسان، اس کے قانون کی اتباع کرتا ہے، یعنی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ آگے آگے خدا (کا قانون) صراطِ مستقیم پر جارہا ہے (اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶) یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے)۔ اور اس کے پیچھے پیچھے اھدنا الصراط المستقیم کی آرزوؤں کو عمل میں لانے والا انسان، اسی راہ پر جارہا ہے اور اس طرح عالمِ آفاق اور جہانِ انسانیت، دونوں اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ کس طرح معلوم ہو کہ فلاں قسم کے حادثہ یا واقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ اس کی طرف سے بھی ہر اس قسم کے حادثہ یا واقعہ پر اس قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس چیز کو خدا نے خود بتا دیا۔ قرآن میں اسمائے حسنہ (مختلف صفات و شئون الٰہیہ) کا ذکر اسی مقصدِ جلیلہ کے لئے آیا ہے۔ کہیں الفاظ کے پیرایہ میں اور کہیں نظامِ فطرت یا امم سابقہ سے متعلق حوادث و وقائع کے سلسلہ میں "خدائی فیصلوں" کی صورت میں۔ قرآن میں غور و فکر سے یہی حقیقت انسان کے سامنے آتی ہے۔ ان چیزوں کو بھی قرآن بلا دلیل و برہان پیش نہیں کرتا۔ وہ بار بار نظامِ فطرت اور احادیثِ امم سابقہ (یعنی تاریخی یادداشتوں) پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ان کے نتائج کو استشہاداً پیش کرتا ہے۔ مقصود ان سب سے یہی ہے کہ انسان سے اس کی حیاتِ اجتماعیہ کے دائرہ میں اسی قسم کی صفات ظہور پذیر ہوں۔ بعض امور میں وہ ان شئون کی عملی صورت بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے (یہ وہ "احکام" ہیں جن کا تعین قرآن نے کر دیا ہے) لیکن اکثر امور میں وہ ان صفات کو اصولی طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ ان کی عملی تشکیل مقتضیاتِ زمانہ کے پیشِ نظر خود متعین کر لی جائیں۔ "حکومتِ الٰہیہ کے قیام" سے مقصود یہ ہے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ (نظامِ تمدن و معیشت) اس انداز کا ہو جائے کہ اس میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہو اور وہ ردِ عمل انسانوں کی طرف سے اس صفت کا ظہور ہو جس صفت کا ظہور، نظامِ کائنات میں ایسے حادثہ پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ "خدا کی محکومیت" سے یہی مقصود ہے۔ یعنی وہ نظامِ اجتماعیہ جس میں انسان "خدا کے

رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ اس ہیئت اجتماعیہ میں انسانی نظام تمدن اسی قسم کے نظم و ضبط اور توازن و توافق کے ساتھ چلتا جائے گا جس حسن و عدل کے ساتھ نظام کائنات چلا جا رہا ہے۔

لہٰذا اسلام میں عبادت سے مفہوم ہے محکومیت اور محکومیت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان، خدا کے پیچھے پیچھے چلتا جائے (اتباع) اور یہ اتباع بطیب خاطر، دل کی مرضی سے ہو نہ کہ کسی جور و استبداد کی اسی کو اطاعت کہتے ہیں۔ اس لئے عبادت، محکومیت، اتباع، اطاعت وغیرہ مختلف الفاظ سے مفہوم وہی رفاقت ہے جس میں خدا، رفیقِ اکبر ہوتا ہے اور انسان، رفیقِ اصغر۔ خدا کی اسی رفاقت و توافق سے انسانی زندگی کا نظام انہی ہمواریوں اور استواریوں کے ساتھ چلتا ہے جن کے ساتھ نظام کائنات چل رہا ہے۔ نظام کائنات، اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں چل رہا ہے۔ اسے اس طرح چلایا جا رہا ہے۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے لہٰذا اپنے نظام کو اسی نہج پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلائیگا۔ انسانی اختیار و ارادہ کو اگر کسی قانون کا پابند نہ کیا جائے تو اسے سرکشی اور طغیان کہتے ہیں اور اس طرح سے قائم کردہ نظامِ اجتماعی کو طاغوتی نظام کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسی اختیار و ارادہ کو سنت اللہ (Behaviour of Reality) سے ہم آہنگ کر لیا جائے تو اس نظام کو نظامِ فطرت یا حکومتِ الٰہیہ کہا جائیگا۔ اسلام کے مختلف شعائر و مناسک اور "عبادات" کے طور طریقے، سب اسی حکومتِ الٰہیہ کے حصول، قیام اور بقا کے ذرائع ہیں۔ اسی کو قرآن نے استخلاف فی الارض کہا ہے۔ اعمالِ صالحہ اس استخلاف کے حصول کے ذرائع ہیں۔ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔ خدا کا یہ وعدہ (اٹل قانون) ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے (یعنی اپنی زندگی کو صفات الٰہیہ کا آئینہ بنانے کا تہیہ کریں گے) اور پھر ان سے اعمالِ صالحہ سرزد ہوں گے (یعنی ایسے اعمال جو نظامِ زندگی میں توازن اور درستی پیدا کر دیں) تو اس کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ کما استخلف الذین من قبلھم اور یہ ایک لفظی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا ان کے ایمان و عمل کا یہی نتیجہ مرتب ہوا۔ اس استخلاف فی الارض سے ہوگا یہ کہ تمہارا یہ نظامِ زندگی جس میں تم نے اپنی حیاتِ ارضی کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لیا ہے مستحکم ہو جائیگا۔ (ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم) اور تمہارا خوف، امن سے بدل جائیگا۔ (ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا) کیونکہ اس نظام میں غلبہ ہمیشہ تعمیری پہلوؤں کو ہوگا کہ جب نظامِ کائنات اور نظامِ انسانی میں ایک ہی قانون عمل فرما ہوگا تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے نتائج مختلف ہوں۔ مختلف نتائج تو مختلف قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں جسے شرک کہا جاتا ہے (یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا)۔ جب تک تم اس پروگرام پر عمل پیرا ہوگے، تمہارا نظام، نظامِ فطرت کی طرح

ہموار چلتا جائے گا۔ جب تم اس سے منہ موڑ لوگے تو پھر زندگی کی ناہمواریاں شروع ہو جائیں گے۔ (ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون)۔ اس نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام ہے (واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ) اور یہ نظام درحقیقت قائم ہوتا ہے مرکزِ حکومتِ الٰہیہ کی اطاعت سے (واطیعوا الرسول) اس انداز سے خدا کا قانون تمہارے ضعف و ناتوانی کو قوت و توانائی میں بدل دیتا ہے (لعلکم ترحمون۔ ۲۴-۵۵-۵۶)

"قیام صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا نظام بڑا تشریح طلب ہے۔ درحقیقت یہ بھی نظام دین (نہ کہ رسوماتِ مذہب) کی اصطلاحیں ہیں۔ لیکن یہ چیز تو ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ یہ "ارکانِ دین" اس نظامِ اجتماعیہ کے حصول و قیام کا ذریعہ ہیں جسے استخلاف فی الارض (حکومتِ الٰہیہ یا تمکن دین) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ "عبادات" مقصود بالذات نہیں، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے یہ "پرستش" کے طور طریقے نہیں بلکہ نظامِ انسانیت کے قیام کے ارکان ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ حج کے متعلق فرمایا ہی یہی ہے کہ اس سے قیاماً للناس مقصود ہے۔ یعنی انسانیت کے نظام کا توازن۔ ان ارکانِ دین میں صلوٰۃ البتہ ایک ایسا رکن ہے جس میں کچھ "پرستش" کا سا شائبہ پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "خدا کی پرستش" کیلئے نماز ہی کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کیا ہے اور اس کے قیام سے کیا مفہوم ہے یہ سوالات ایسے نہیں جن کا جواب ضمنی طور پر دیا جا سکے۔ صلوٰۃ کے نظام میں، پورے کے پورے دین کا نظام چھوٹے پیمانہ پر منعکس ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس نظام کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے پورے کا پورا نظامِ دین سامنے ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس وقت صلوٰۃ کے متعلق بھی صرف اشارات پر اکتفا کیا جائیگا۔

صلوٰۃ میں ہماری اجتماعی زندگی، ائتلاف، مساوات، رفاقت، اطاعت، یک جہتی، یک نگہی وغیرہ کس طرح سمٹ کر سامنے آ جاتی ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں اس اجتماعی نظام کے انعکاس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اور یہی "کچھ اور" رہ ہے جو اسے "پرستش" کی طرف کھینچ کر لے گیا ہے۔ لہٰذا اس "کچھ اور" کا سمجھنا ضروری ہے۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ انسانی نظامِ حیات کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کائنات کی آفاقی دنیا میں سنت اللہ کس طرح کارفرما ہوتی ہے یعنی کن حوادث کیلئے کس قسم کی صفاتِ الٰہیہ کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ یہ مطالعہ فطرت ہے۔ لیکن چونکہ مطالعہ فطرت کی یہ کاوش ذہنی ہوتی ہے اس لئے اس سے قلب متاثر نہیں ہوتا، اور چونکہ قلب (ارادہ) ہی تمام اعمال کا سرچشمہ اور تمام تحریکات کا منبع ہوتا ہے اس لئے جب تک قلب (ارادوں کا سرچشمہ) متاثر نہ ہو، انسانی اعمال میں آمد (Spontaneity) پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی ان اعمال کی تفجیر عمق قلب سے نہیں

ہوتی جس سے انسانی سیرت مرتب ہوتی ہے۔ اس کیلئے، فکری تدبر سے گہرے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ "تدبر" صلوٰۃ سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں

> فکر کے ذریعے، قلبِ انسانی یہ معلوم کرتا ہے کہ کائنات میں حقیقتِ مطلقہ کی کارفرمائیاں کیا ہیں۔ لیکن صلوٰۃ میں، انسانی فکر، اس قسم کی سُست رو جستجو سے ہٹ کر، اس عروجی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تاکہ خود حقیقت کو پالے اور اس طرح اپنی زندگی میں حقیقت کے ایک باشعور رفیق کی حیثیت حاصل کرلے۔ اس میں "باطنی قسم کی (Mystical) کوئی بات نہیں۔ (بات صاف صاف ہے)۔ صلوٰۃ نفسِ انسانی کے جگمگانے کا ایک ایسا قوی ناعمل ہے جس سے ہماری ذات کا چھوٹا سا جزیرہ، حیاتِ کلی کی وسعتوں میں اپنا صحیح مقام پالیتا ہے۔ . . . . لہٰذا صلوٰۃ کو مطالعہ فطرت کا ایک ضروری تکملہ (Complement) سمجھنا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ انسان اس مادی کائنات ہی کا ایک حصہ (یا اس کی ارتقاء یافتہ شکل) ہے لیکن اس میں کچھ ایسا بھی ہے جو اپنے آپ کو اس مادی کائنات میں سے نہیں سمجھتا۔ وہ "کچھ" درحقیقت اس مادی کائنات میں سے ہے بھی نہیں۔ یہی وہ ہے جو انسانی حقیقت ہے اور جسے عام طور پر نفسِ انسانی کہا جاتا ہے۔ نفسِ انسانی کائنات کی مادی چار دیواری میں کسی کو اپنا رفیق نہیں پاتا۔ اور چونکہ تنہائی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ اپنی رفاقت "اقطار السموٰت والارض" سے باہر تلاش کرتا ہے۔ اس کی اس تلاش کا ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ اقبال کے الفاظ میں "صلوٰۃ" انسان کی اس قلبی آرزو کا اظہار ہے جس میں یہ کائنات کے مہیب سکوت میں اپنی پکار کا جواب سننا چاہتا ہے"۔ اس حقیقت کو ولیم جیمس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

> اگرچہ انسان کے تجرباتی نفس کا عمیق ترین گوشہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے لیکن اسے رفیقِ اعلیٰ[1] ہمیشہ (مادی دنیا میں نہیں بلکہ) ایک مثالی دنیا میں ملتا ہے۔ دعا کا جذبہ محرکہ اس حقیقت کا فطری نتیجہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب انسان دیکھتا ہے کہ اس "رفیقِ اعلیٰ" کی صفات کا عکس، اپنی محدودیت کے باوجود اس کی حیاتِ اجتماعیہ میں ایسا تحیر انگیز انقلاب پیدا کر دیتا ہے، تو اس تصور سے کہ ان صفات کی لامحدودیت، کائنات میں کس قدر محیر العقول نتائج پیدا کر رہی ہوگی، اس میں وجودِ مسرت کی ایک عجیب

---

[1] "رفیقِ اعلیٰ" مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ لفظی ترجمہ ہے۔ جیمس کے الفاظ (Great Companion) ہیں۔ غور کیجئے! ولیم جیمس دورِ حاضرہ کا عظیم ترین نفسیاتی عالم ہے وہ اپنے مفہوم کی ادائیگی کیلئے الفاظ تک بھی وہی لا رہا ہے جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر عرب کے صحرا میں ایک "ان پڑھ" کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

والہانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ان صفات کے سرچشمۂ سرمدی کے لئے اسے پیکرِ حمد و ستائش بنا دیتی ہے۔ اسی جذبہ کی مشہود صورت کا نام صلوٰۃ ہے۔ اس حمد و ستائش (Appreciation ...) (تحمید و تہلیل) کے اظہار میں جہاں ان کیلئے اپنے مقابلہ میں اس "رفیقِ اعلیٰ" کی ملکوت و کبریائی کا اعتراف مضمر ہوتا ہے وہاں کائنات کے مقابلہ میں خود اپنی ذات کی بلندیوں اور ہمہ گیریوں کا اثبات بھی مقصود ہوتا ہے۔ سجود اور قیام اسی خردی اور بزرگی کے مظاہر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اپنی خردی اور اس کے علاوہ ادر سب کے مقابلہ میں اپنی عظمت اور بزرگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

> صلوٰۃ، انکشافِ حقیقت کا ایک عدیم النظیر طریقہ ہے جس میں متجسس ایغو نفی خولیش کے لمحہ میں اپنی ذات کا اثبات بھی کرتا جاتا ہے اور اس طرح حیاتِ کائنات میں ایک محرک عنصر (Dynamic Factor) کی حیثیت سے اپنی ذات کی قدر و قیمت اور جوازِ ہستی کا انکشاف کر لیتا ہے۔

یہ ہے مقصود صلوٰۃ سے۔ اور اس کے ساتھ جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھ لیا جائے کہ صلوٰۃ ایک اجتماعی عمل ہے، اور اجتماعی عمل کے متعلق دورِ حاضرہ کی نفسیاتی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ یہ "ایک عام انسان کی قوتِ مدرکہ کو مضاعف کر دیتا ہے، اس کے جذبات میں عمق پیدا کرتا ہے اور اس کی قوتِ ارادی کو اس درجہ محرک بنا دیتا ہے جس کا یہ اپنی انفرادی ذات میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" (اقبالؒ)۔ تو پھر یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ سے صحیح مفہوم کیا ہے اور یہ کس طرح "پرستش" سے یکسر الگ شے ہے۔

بہرحال، یہ ہے مختصر الفاظ میں عبادت کا قرآنی مفہوم۔ وہی عبادت جو دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے پرستش کی چند رسومات اور پوجا پاٹ کی حرکات و سکنات بن کر رہ گئی۔

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی سورج کی آنکھ نے کہیں دیکھا ہے؟

علمِ تفسیر

(از علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور پر اہلِ عرب سمجھتے تھے، خود قرآنی آیات میں قرآن کی زبان "عربی مبین" کہی گئی ہے یعنی بین اور واضح، اس لفظ کا استعمال قرآن میں جا بجا اسی معنی میں ہوا ہے، مثلاً "فاتوا بسلطان مبین" لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل "اِنَّ الشَّیْطَانَ للانسانِ عدو مبین" شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے اپنی بھی صفت یہی بیان کی ہے، یعنی "الکتاب المبین" بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے کو نور مبین کہا ہے، نیز آیاتِ قرآنی کو بھی "ایات بینات" کے نام سے موسوم کیا ہے "بل ھو ایات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم" بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔

الغرض قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہوا بلکہ جگمگاتا ہوا نور ہے، یہی سبب ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" اور ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کے لئے آسان کر دیا، کوئی ہے جو نصیحت لے؟ نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اہلِ عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے جس کی وجہ سے قرآن نے ان کو امیین کا لقب دیا اور فرمایا "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم" وہی اللہ جس نے ناخواندہ لوگوں میں انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا۔ ان امیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ان القرآن نزل بلغۃ العرب علی اسالیب بلاغتھم فکانوا کلھم یفھمون ویعلمون معانیہ فی مفرداتہ وتراکیبہ (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۶۷)

قرآن عرب کی زبان میں ان کے اندازِ بلاغت کے مطابق نازل ہوا۔ ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا تھا۔

علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہلِ عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے اور نہ

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فرد امت عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ خود حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق روایت ہے کہ کسی نے ان سے "وفاکھۃ وابا" میں "ابا" کے معنی پوچھے، جواب دیا کہ ہم کو تکلف وتعمق سے ممانعت کی گئی ہے۔ ایک بار انھوں نے منبر پر یہ آیت پڑھی "او یاخذھم علیٰ تخوف" اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت کئے، بنی ہذیل کے ایک شخص نے کہا کہ اس کے معنی تنقص کے یعنی کم کرنے کے ہیں۔ اور سند میں یہ شعر پڑھا۔[۱]

تخوف الرحل منہا تامکا قردا   کما تخوف عود النبعۃ السفن

علیٰ ہذا ایک بار جمعہ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد جو امور سب سے اہم چھوڑ جاؤں گا ان میں مسئلہ کلالہ بھی ہے، میں نے جس قدر بار بار اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور کسی مسئلہ کو نہیں پوچھا، اور اس میں آپ نے جس قدر سختی میرے ساتھ روا رکھی اور کسی مسئلہ میں روا نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ اپنی انگلی میرے سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اے عمر! کیا تیرے لئے اس امر میں آیت صیف کافی نہیں ہے جو سورۂ نساء کے آخر میں ہے۔[۲]

یہ واقعات تو حضرت عمرؓ کے بیان کئے گئے ہیں، جن کے علمی اور عقلی رتبہ سے ہم سب واقف ہیں پھر دوسرے تمام صحابہ کے متعلق یہ کیوں کر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر لفظ اور ہر ترکیب قرآنی کا علم رکھتے تھے۔ ہاں ایک اجمالی مفہوم ضرور سمجھ لیتے تھے۔ مثلاً "وفاکھۃ وابا" میں ان کیلئے یہ سمجھ لینا کافی تھا کہ یہاں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر ہے "ابا" بھی انہیں میں سے ایک ہے، ہر ایک کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی نہیں خیال کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیاتِ قرآنی کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی سے روایت ہے کہ صحابہ نبی صلعم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہیں لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں بڑا ہو جاتا تھا۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصول دین اور احکام شریعت سے تعلق رکھتی ہیں، یا انبیاء کرام اور اقوام سابقہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں ان کا سمجھنا جمہور کیلئے آسان ہے مگر اسی کے ساتھ آیات متشابہات اور حقائق غامضہ بھی ہیں جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرام میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا علمی پہلو غالب تھا۔

---

[۱] کتاب الموافقات ص ۵۷۔۵۸۔ [۲] تفسیر ابن جریر ج ۶ ص ۲۷۔ [۳] مسند امام احمد۔

یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزا میں نمایاں اور صاف لکھی جا سکتی ہے قیامت تک کیلئے امتِ اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے، اور ہر زمان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے، اگر یہ ایسے حقائق جاودانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابدالاباد تک انسانی نسلیں ختم نہ کر سکیں گی تو کیوں کر ان کا دائمی نصاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی، بلکہ اس میں تفکر اور تدبر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے مثلاً:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ (۳۸/۲۹)

مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں۔

دوسری جگہ ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)

کیا وہ قرآن پر غور نہیں یا دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔

ایک اور آیت ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۱۶/۴۴)

اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا تاکہ لوگوں کیلئے جو اتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

الغرض اہلِ نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے اپنی ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ فطرت کی دیگر اشیاء کی طرح جن میں غور کرنے سے جدید انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور ان کے دریافت کرنے سے انسانی قومیں نت نئے منافع اور فائدے حاصل کرتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب بھی کبھی ختم ہو جانے اور تھک جانے والی نہیں ہے، بلکہ انسانی نسلوں کی قیامت تک رہنمائی کرتی رہیگی اور ہر زمانہ اور ہر ماحول میں ان کے سامنے ہدایت کی راہیں کھولے گی۔ اس کا دعویٰ ہے:

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (۶۸/۵۲)

وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کیلئے نصیحت۔

یعنی جملہ بنی نوع انسان کیلئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں۔ سورۂ نحل میں ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح ہے۔

دوسرے مقام پر "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" کی بجائے "تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ" اس کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس ہر شے کے تبیان اور تفصیل کے لفظ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں ایسے حقائق مستمرہ کی تشریح ہے جن سے ہمیشہ انسانی نسلیں ہدایت کی راہیں نکالتی رہیں گی۔

یہی وجہ تھی کہ عہد رسالت میں فقہاء صحابہ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم، کیونکہ کثرت سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔

علامہ سیوطی نے اپنی معرکہ کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے جو صحابہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہیں وہ کل کی کل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں اور تنقید صحیح کے بعد تو بہت ہی تھوڑی رہ جاتی ہیں۔

مفسرین صحابہ جن صحابہ کرام سے یہ تفسیر کی روایتیں آئی ہیں ان میں سے جو حضرات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں وہ خلفائے اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے حضرات شیخین سے بوجہ ان کے تقدم عہد اور امور امت میں مشغولیت کے نہایت کم روایتیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ قرآن سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر اس کی تلاوت میں گزارا کرتے، بلکہ کبھی کبھی خضوع و خشوع میں جب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تو ایک ہی آیت کو بار بار گھنٹوں تک دہراتے رہتے مگر تفسیر کی روایتیں ان سے بھی بہت کم مروی ہیں۔ زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو کتاب اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لو، کیونکہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اتری، کب اتری اور کس کی بابت اتری اور دربار نبوی میں میں سوال کی جرأت بھی زیادہ رکھتا تھا۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی زیادہ روایتیں آئی ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے اور جن کا لقب بوجہ اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور آپ کی نعلین بھی اٹھاتے تھے صاحب النعلین تھا۔ انھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی ستر سورتیں یاد کی تھیں اور اپنے تمام انداز عمل میں آپ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت پیدا کر لی تھی ان کی وفات ۳۳ھ میں ہوئی۔

حضرت ابی بن کعب خزرجی انصاریؓ عہد رسالت میں کاتب وحی تھے اور صحابہ میں سید القراء اور قرآن کے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں انتقال فرمایا اور انھوں نے ان کے

---

[1] مرآۃ التفسیر ص ۹۔

جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت زید بن ثابت کاتب دربار رسالت نجبار انصار اور علمار قرآن میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا اس میں شریک تھے جس کی وجہ سے عہد صدیقی میں جب قرآن ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا یہی اس کے جامع قرار پائے، حضرت عبداللہ بن عباس ان کی رکاب تھاما کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علمار کی تکریم اس طرح کرنی چاہیے ۴۸ھ میں وفات پائی۔

مگران دونوں حضرات یعنی ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ سے تفسیریں کم مروی ہیں سب سے زیادہ روایتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آئی ہیں جن کا لقب بوجہ قرآن دانی کے حبرامت اور ترجمان القرآن تھا۔ ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ۔ اے اللہ اس کو دین کی فقاہت اور قرآن کی فہم عطا فرما۔

یہ اگرچہ صغار صحابہ میں سے تھے مگر حضرت عمرؓ ان کی عقل وفراست اور قرآن فہمی کی وجہ سے ان کو اپنی مجلس شوریٰ میں شریک رکھتے تھے اور مشکل امور میں رائے لیتے تھے، ان کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، انس ابن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ وبعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔

اکثر صحابہ کرام بہ نظر احتیاط لغوی معانی پر اکتفا کرتے تھے جو بعض الفاظ یا آیات قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو۔ لیکن بعض صحابہ ابن مسعود اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے، یا بعض اہل مذاہب مثلاً خارجی، شیعہ، قدری، مرجی وغیرہ جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے۔ (فجر الاسلام ص ۲۳۵)

اس زمانہ میں تفسیر کیلئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم وعادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ کا جاننا ضروری تھا، انھیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔

اسرائیلیات قرآن میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاح نفوس بشری کیلئے ضروری ہے۔ مثلاً عالم کی تکوین، آدمؑ کی پیدائش اور انبیاء سابقین

اور اقوام گذشتہ کے واقعات اور انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے اس لئے عہد صحابہ میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے دریافت کرتے تھے۔ خود حضرت ابن عباسؓ جبر امت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان کی روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب، مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی حرج نہ سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہو گئیں۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے:

> بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔ جب ان کو موجودات کے اسباب، ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے دریافت کرتے، یہ بھی زیادہ تر انہیں کی طرح بدوی تھے اور ان امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب۔ انہی کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہو گئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور ان کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا۔ (مقدمہ ص ۲۶۷)

عہد رسالت میں اہل کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے ان میں سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآن کریم نے "اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" کہہ کر اہل علم میں شمار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں جو ہجرت نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے۔ ان کا انتقال ۴۳ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہؓ اور انس بن مالکؓ نے روایت کی ہے۔

دوسرے حضرت سلمانؓ فارسی ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتش کدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے۔ گھر سے نکل کر ملک شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ ایک مدت تک نصیبین اور اس کے بعد عموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا۔ پھر عرب کی طرف آئے۔ وادی القریٰ میں بنی کلب نے غداری سے ان کو غلام بنا لیا اور فروخت کر ڈالا، قسمت کی یاوری سے مدینہ پہنچے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی۔[1]

جس طرح حضرت بلالؓ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیب کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا، اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمان فارسی کو اپنی قوم کا پیش رو قرار دیا،

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۵۳۔

ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں بالخصوص صوفیہ عجم نے، جن میں سے اکثر اپنا سلسلۂ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں۔

تیسرے صحابی جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تمیم داریؓ ہیں جو ۹ھ میں مدینہ میں آکر مسلمان ہوئے تھے، یہ نصارائے یمن میں سے تھے۔ اور قصہ گوئی کرتے تھے۔ یعنی گذشتہ انبیاء اور اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی مگر انھوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کیلئے نکلوں تم قصے سنا لیا کرو۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی[1]۔ جساسہ اور دجال کی روایتیں انہی سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں ایک قصص عامہ کہ مسجد میں قصاص مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سنایا کرتے جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے دوسری قصص خاصہ جو کسی بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے[2]۔ عہد صحابہ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ یہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانے ہوتے تھے اس وجہ سے حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کردی، بجز حسن بصریؒ کے کہ وہ سچائی کا خیال رکھتے تھے[3]۔

تابعین عہد صحابہ کے بعد روایت تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے زیادہ شہرت پائی۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباس جو ان کے مخصوص ترین شاگرد بھی تھے۔ یہ اپنے آقا یعنی عبداللہ ابن عباسؓ، نیز حضرت عائشہ اور ابوہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

عطاء بن رباح۔ یہ حضرت عثمان، اسامہ بن زید، حضرت عائشہ، ام سلمہ، ابوہریرہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں علماء مکہ میں فتوے کی ریاست انہی پر منتہی تھی۔ ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

ضحاک بن مزاحم خراسانی۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن عمر، زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۱۰۵ھ ہے۔

سعید بن جبیر کوفی۔ یہ ابن عباس، عدی بن حاتم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم سے قتل کئے گئے۔

مجاہد بن جبیر۔ یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں اور زیادہ تر انہی سے روایت کرتے ہیں، ۱۰۳ھ میں مکہ میں عین سجدہ کی حالت میں وفات پائی۔

---

[1] اصابہ ج ۱ ص ۸۴ ۔ [2] خطط مقریزی ج ۲ ص ۳۵۳ ۔ [3] فجر الاسلام ص ۱۸۸

حسن بصری۔ یہ انس بن مالک، جندب بن عبداللہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۱۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے علاوہ امام مسروق، زید بن اسلم، قتادہ، ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور عوفی وغیرہ اس طبقہ کے علماء تفسیر میں ممتاز ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء مکہ میں تھا، جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطاء، پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے جیسے حسن بصری اور مسروق وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ عوام کا رجحان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیا اور اقوام کے قصص ہیں ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں، اس کے لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینۂ نوح کی مقدار اور وسعت، اس میں جن جانداروں کے جوڑے لادے گئے تھے ان کے اقسام، حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں چڑیوں پرندوں کے انواع۔ حضرت خضرؑ کے ذکر میں غاصب بادشاہ کا خاندان اور اس بچہ کا نام و نسب جس کو خضرؑ نے قتل کیا تھا، حضرت یوسفؑ نے جن گیارہ ستاروں کو خواب میں دیکھا تھا، ان کے نشانات و مقامات، حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں ان کی بیوی کے متعلق تحقیق کہ وہ حضرت شعیبؑ کی چھوٹی بیٹی تھیں یا بڑی، پھر یہ کہ انھوں نے آٹھ یا دس سال کی دونوں مدتوں میں سے کونسی مدت پوری کی۔ اصحاب کہف کے نام اور ان کے کتے کے رنگ و نسل غرض اس قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لایعنی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا بحث و تفتیش کرنے لگے یہی معلومات کے ذریعہ سے پھیلیں اور جب تفسیریں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں۔ ایک کعب بن ماتع جو یمن کے یہودی تھے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے حضرت ابن عباسؓ اور ابوہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔

دوسرے وہب بن منبہ۔ یہ بھی یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے، ان کی وفات صنعاء میں ۱۱۰ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقات مثلاً ابن قتیبہ یا امام نووی وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں لیکن ثعلبیؒ وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہی کی مرویات درج کی ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

اتباعِ تابعین اس طبقہ میں بالعموم حاملین روایت کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ ان میں سے جن کے نام تفسیر کے ساتھ مشہور ہوئے حسب ذیل ہیں:۔

عطاء بن دینار متوفی ۱۲۶ھ، مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ، سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ، وکیع بن الجراح متوفی ۱۹۶ھ، سفیان بن عُیَینہ متوفی ۱۹۸ھ، نیز ابن جریج، اسحٰق بن راہویہ، آدم بن ایاس، عبدالرزاق، اور امام مالک وغیرہ

اس طبقہ کے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں بھی مدون کرنی شروع کیں۔ چنانچہ تاریخوں میں ان میں سے بعض تفاسیر کا ذکر ہے۔ مثلاً تفسیر ابن جریج، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابوبکر ابن ابی شیبہ وغیرہ۔ مگر یہ سب کی سب فنا ہوگئیں اور ان میں سے کوئی بھی امت کے ہاتھوں میں باقی نہیں رہی۔

ان کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے شیوخ سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں سنتے ان کو قلمبند کر لیتے تھے۔ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہوتا تھا جس کی وجہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ اس طبقہ میں ان روایات کے بطل کبیر ابن جریج ہیں جن کی نسبت بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے یہ ۸۰ھ میں اسلام لائے تھے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ رومی الاصل تھے، اور امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جریج نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا تھا۔[1] ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں انہوں نے ہی مدون کی تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد یعنی تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب عام ہوگئیں اسی میں صحاح ستہ لکھی گئیں جن میں تفسیروں کی روایتیں کتاب التفسیر کے عنوان سے سورتوں کی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں۔ ان کا بھی عام انداز وہی ہے جو ان کے اساتذہ کا تھا یعنی انہوں نے جستہ جستہ الفاظ و آیات قرآن کے متعلق متقدمین سے جو روایتیں سنی ہیں ان کو درج کر دیا ہے، یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرام یا ان کے تلامذہ کی ہیں خال خال ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں۔ کتب صحاح ستہ کی تفسیروں کے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں، اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں مگر خود ان سے ان کا کوئی گوشہ بھی سیراب نہیں ہوتا۔

تنقید تفسیر زیادہ تر اسی زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی۔ تفسیری روایات کا بڑا حصہ جو ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا، کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابوصالح مصری، محمد بن صائب کلبی، السدی، محمد بن

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۴۲۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۳۔

مروان، یسر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں سے وضاع نکلے[1]۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباس کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجہول نکلیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے شیعہ انھیں اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو اُن کے نام کے ساتھ منسوب ہوں، اس لئے شیعہ رواۃ بیشتر انہی کے نام سے روایتیں کرتے تھے، بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جس سے حضرت علیؓ کا علمی رتبہ ظاہر ہو اس کو بھی انہی کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی جمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں[2]۔ وضع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نام سے جو روایات کی گئی ہیں ان کی کل تعداد ۲۸۶ ہے جن میں سے ائمہ حدیث کے نزدیک اصول کی رو کر صرف پچاس صحیح ہیں[3]۔

حضرت ابن عباسؓ جن کی نسل سے خلفائے عباسیہ تھے، مقربین بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو، ان کی کل روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے[4]۔ جن میں سے امام شافعیؒ کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں[5]۔

ابن عباسؓ سے روایت کے جتنے طرق ہیں ان میں سب سے معتبر طریقہ "ابن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ" ہے۔ مگر جملہ حفاظ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقا حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے، وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے "قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ" ہے، مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جو یبر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں، اور اس کے ساتھ جب مروان بن محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے[6]۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔

---

[1] مراۃ التفسیر ص ۲۰ تا ۲۸۔ [2] فجر الاسلام ص ۲۳۸۔ [3] الملل والنحل لابن حزم ج ۴ ص ۱۳۷۔ [4] مراۃ التفسیر ص ۹۲
[5] اتقان ج ۲ ص ۱۹۵۔ [6] اتقان ج ۲ ص ۱۹۵۔

چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کا جو جرح و تعدیل کے امام، اور بخاری و مسلم کے استاد ہیں قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم، اور تفسیر۔[1]

ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشاء یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے۔ مثلاً القناطیر المقنطرۃ کی تفسیر میں امام حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے۔[2]

مکمل تفسیریں تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں۔ مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ھ، تفسیر ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر امام حاکم متوفی ۳۵۱ھ تفسیر ابن حبان متوفی ۳۶۹ھ وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک نے صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علما سے روایات درج کی ہیں، خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے بجز ابن جریر طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد اس کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہوتے ہیں ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں، الفاظ سے گزر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی ان کا رویہ بعینہٖ یہی ہے، کہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مؤلف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے۔ دراصل ان کی تفسیر اس کل قرآنی علوم کا مجموعہ ہے جو اس وقت تک علمائے اسلام کے پاس تھا۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابوحامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی۔ آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے، یہ ام التفاسیر بولی جاتی ہے، کیونکہ زمانۂ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی صرف یہ ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں، لیکن چونکہ سند ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہر ص ۸۲۔ [2] الاتقان ج ۲ ص ۱۹۹۔ [3] مرآۃ التفسیر ص ۳۸۔

شاگرد رشید حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کرکے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

علمی تفسیریں اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں وہ خالص منقولی تھیں۔ یعنی روایات کا مجموعہ، لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہوگئی تھیں۔ صرف ونحو، بلاغت ومعانی، فقہ واصول، منطق وفلسفہ، کلام وتصوف وغیرہ کا عام رواج ہوچکا تھا۔ ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں ان میں بیشتر اپنے فنی زاویۂ نظر سے الفاظ وآیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہوگئے تھے۔ ان اہل مذاہب نے اپنے عقائد وخیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہوگئی اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہوگئیں۔ مثلاً زجاج اور کسائی وغیرہ نے جو صرف ونحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لغظی تصرفات اور وجوہِ اعراب سے بحثیں کیں۔

ثعلبی اور ابن اثیر نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابواللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعات فقہیہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی، ابومسلم اصفہانی اور زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائنی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں۔ عبدالقاہر جرجانی اور ابوہلال عسکری نے بلاغت ومعانی کے لطائف ظاہر کئے۔ محی الدین ابن عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے لیکر مفتی محمد عبدہٗ اور سرسید احمد خاں تک ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد وخیالات کا آئینہ نظر آتی ہے۔

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہوگئی لیکن بیجا تاویلات کا راستہ بھی کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیاتِ قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کئے گئے علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق ہے قیاسی قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ مغازی نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔[۵۱]

شرائط تفسیر متاخرین نے مفسر کیلئے کم سے کم پندرہ علوم جاننے کی شرط لگائی ہے، لغت، اشتقاق صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، قرأت، کلام (اصولِ دین) اصول فقہ، اسباب نزول، قصص، ناسخ ومنسوخ، فقہ اور حدیث۔[۵۲]

---

[۵۱] مراۃ التفسیر ص ۳۸۔ [۵۲] ایضاً ص ۷۔ [۵۳] اتقان، ج ۲ ص ۱۸۷۔

لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہ و تابعین اور تبع تابعین صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا ماخذ خود قرآن ہے۔ اسی سے علما نے اس کو نکالا ہے۔ پھر یہ فہم قرآن کیلئے شرط کیوں کر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد جنہوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے، ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں جن میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں، چنانچہ وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علما نے قابل اعتراض قرار دیا ہے نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے۔

کتب تفسیر امام ابن جریر طبری کے بعد جس قدر تفسیریں لکھی گئیں، ان کو کون شمار کر سکتا ہے، صرف کشف الظنون میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے نو سو تفسیروں کا نام بنام مندرج ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب اکسیر میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج بھی یقیناً کئی ہزار تک پہنچے گی۔ اس موقع پر بہ ترتیب زمانہ چند مشہور تفسیروں کا نام لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

چوتھی صدی ہجری میں تفسیر ابوالحسن اشعری امام اہل سنت متوفی ۳۲۴ھ تفسیر محمد بن علی ادفوی متوفی ۳۸۸ھ اس کا نام استغنا فی القرآن ہے اور ایک سو بیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر خلف بن محمد والی سیستان متوفی ۳۹۹ھ۔ یہ تفسیر سجستانی کے نام سے مشہور ہے اور سب سے بڑی تفسیر ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں تفسیر ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ تفسیر ابن ابوطالب مکی متوفی ۴۳۷ھ تفسیر امام ماوردی متوفی ۴۵۰ھ۔ تفسیر ابومسلم اصفہانی متوفی ۴۵۹ھ۔ تفسیر امام اسفرائینی متوفی ۴۷۱ھ تفسیر امام الحرمین استاد امام غزالی متوفی ۴۷۸ھ۔ تفسیر راغب اصفہانی متوفی ۵۰۰ھ۔

چھٹی صدی ہجری میں تفسیر امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ جس کا نام یاقوت التاویل ہے اور چالیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر امام بغوی محی السنۃ متوفی ۵۱۶ھ، تفسیر کشاف جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ، تفسیر امام ابن الجوزی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ۔

ساتویں صدی ہجری میں تفسیر امام رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ۔ تفسیر سخاوی متوفی ۶۴۳ھ تفسیر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ۔

آٹھویں صدی ہجری میں تفسیر خازن شیخ علاء الدین علی بن محمد بغدادی متوفی ۷۲۵ھ، تفسیر بحر المحیط ابوحیان اندلسی،

نویں صدی ہجری میں تفسیر علامہ مجدالدین فیروزآبادی صاحب قاموس متوفی ۸۱۷ھ

تفسیر امام بلقینی متوفی ۸۲۴ھ۔

اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئیں وہ زیادہ تر انھیں تفسیروں کا خلاصہ یا التقاط ہیں، ان کے نام گنانے کی ضرورت نہیں، البتہ ان چند تفسیروں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں، ان میں سب سے مقدم ابن جریر طبریؒ کی تفسیر ہے جس کی مختصر کیفیت ہم لکھ چکے ہیں۔ ہر زمانہ میں اہل علم اسی کو سب سے بہتر تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا تشریح قرآن کے لحاظ سے وہی پہلی تفسیر ہے اور وہی آخری تفسیر ہے۔ آج تک کوئی تفسیر اس کے رتبہ کی نہیں لکھی جا سکی۔

دوسری جس نے علماء ادب میں شہرت حاصل کی ہے، کشاف ہے۔ اس کے مؤلف علامہ زمخشریؒ بلاغت و معانی کے امام تھے۔ انھوں نے اسی نوعیت سے یہ تفسیر لکھی، لیکن زیادہ زور پہلے ہی پارہ کی تفسیر میں صرف کر دیا ہے، مگر اس میں اپنی فن دانی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔

تیسری تفسیر جو علماء معقول میں مقبول ہوئی امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر کبیر ہے۔ اس میں طویل الذیل فلسفیانہ بحثیں ہیں، یہ اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب عالم اسلامی میں منطق، فلسفہ اور علم کلام زیادہ رائج تھا، اس واسطے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ لیکن اہل منقول نے اس کو پسند نہ کیا کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں بعض باتیں ان کے قدیم خیالات کے مطابق نہ تھیں۔ ان کو آیات کے ساتھ ان متکلمانہ مباحث کا جوان کے تحت میں لکھے گئے ہیں ربط نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے کہہ دیا کہ "رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے"۔

امام رازی نے ربط آیات کی طرف بھی جا بجا اشارات کئے ہیں مگر ہر جگہ اس کا خیال نہیں رکھا، ان کے بعد علامہ شرف الدین ابو الفضلؒ متوفی ۶۵۵ھ نے اپنی تفسیر میں جو بیس جلدوں میں ہے اور تفسیر مرسی کے نام سے مشہور ہے، ہر ہر آیت کے باہمی ربط اور اس کے وجوہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔ اسی عنوان پر شیخ علی جمائی متوفی ۸۲۵ھ نے جن کا مزار بمبئی میں زیارت گاہ ہے اپنی تفسیر تبصیر الرحمان لکھی۔ پھر شیخ ابراہیم بقاعی متوفی ۸۸۵ھ نے تفسیر بقاعی تالیف کی جو فی الجملہ اس سے بہتر سمجھی گئی۔ اس آخری زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ربط آیات کے عنوان سے تفسیر نظام الفرقان عربی زبان میں لکھ رہے تھے، جو ان کے انتقال کر جانے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی، صرف اس کے بعض اجزا شائع ہوئے ہیں۔

آیات کے علاوہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے باہمی تناسب پر شیخ ابو حیان نے اپنی تفسیر البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن لکھی ہے۔ شیخ ابو الفیض فیضی اکبر آبادی متوفی ۱۰۰۴ھ کی تفسیر سواطع الالہام کسی معنوی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

موجودہ دور میں شیخ جوہری طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، لیکن علمی لحاظ سے بہترین تفسیر شیخ محمد عبدہٗ کی ہے، جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ المنار مصر کر رہے تھے مگر افسوس ہے کہ ابھی نصف قرآن تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سید صاحب موصوف انتقال کر گئے اور یہ مفید تفسیر ناتمام رہ گئی۔

نصاب درس کے لئے علماء اہل سنت کو صحت مفہوم اور اختصار دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر تفسیر جلالین ہی جو نصف قرآن تک شیخ جلال الدین محلی متوفی ۸۶۴ھ اور بقیہ نصف شیخ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی قسم کی مختصر تفسیر مدارک بھی ہے جو علامہ نسفی کی تالیف ہے اور بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سورۂ بقر تک بھی پرانے مدارس میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ بیضاوی دراصل تین اہم علمی تفاسیر کا خلاصہ ہے۔ جہاں تک معانی و بیان کا تعلق ہے کشاف سے ماخوذ ہے متکلمانہ بحثیں تفسیر کبیر رازی سے اور حقائق و لطائف تفسیر راغب اصفہانی سے۔ (قضاء الارب ص ۲۳۸)۔

علوم قرآن جب سے مسلمانوں میں مختلف علوم کا رواج ہوا، اسی وقت سے اہل فن نے قرآن کے ایک ایک شعبہ پر جداگانہ بحثیں شروع کیں اور ان کے متعلق کتابیں تصنیف کرنے لگے مثلاً لغات القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، قصص القرآن، احکام القرآن اور حجج القرآن وغیرہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں ان علوم کو اسی انواع کا شمار کیا ہے اور ان کے اوپر جو مشہور مصنفین ہیں ان کو گنایا ہے۔ لیکن دراصل ان انواع کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے، اور ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے، جس پر تصانیف کے انبار ہیں۔ مثلاً الفاظ القرآن۔ اس پر بہت سے علماء ادب ولغت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ابو عبیدہ، ابو عمرو زاہد اور ابن درید کی کتابیں مشہور ہیں۔ ان سب کا مجموعہ العزیزی کی کتاب ہے جس کو انھوں نے اپنے استاد ابو بکر ابن الانباری کی معیت میں پورے پندرہ سال کی محنت میں تیار کیا ہے۔ آخر میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن لکھی، جو الفاظ قرآن کے متعلق سب سے مفید ترکتاب تسلیم کی گئی ہے۔

اسی طرح اعجاز القرآن پر امام خطابی، رمانی، زملکانی فخر الدین رازی ابن سراقہ اور ابو بکر باقلانی کی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے نامور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد پوری اسی عنوان پر لکھی ہے جو سب سے بہتر جامع اور دلکش تصنیف ہے۔ علی ہذا اقسام القرآن، امثال القرآن متشابہات القرآن، مبہمات القرآن، بلکہ آیات، الفاظ اور حروف قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں ہے جس پر تصنیفیں نہ ہوں۔ یہانتک کہ خواص القرآن یعنی آیات سے تعویذات، عملیات اور نقوش وغیرہ پر بھی تمیمی، امام غزالی، اور یافعی وغیرہ نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔

قرآنی علوم پر یہ کتابیں مفسروں کیلئے نہایت کارآمد ذخیرہ ہیں جن سے وہ اپنی تفسیروں میں مدد لیتے ہیں۔

نقائصِ تفسیر گذشتہ صفحات میں ان خرابیوں کی طرف جو تفسیر میں واقع ہوئیں ضمناً اشارات کئے گئے ہیں۔ اب میں ان کے بڑے بڑے نقائص کو تفصیل وار بیان کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر مرتب نہیں کئے گئے ہیں بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرے ان کی بنا محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانۂ مابعد میں امام ابن تیمیہؒ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے، اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے اصول تفسیر میں ایک رسالہ فوز الکبیر لکھا لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے، ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے، بلکہ وہ شاہ صاحبؒ کے فہم قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ مغازی کا قول نقل کر چکا ہوں کہ "تفسیر کیلئے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔"

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ بیان نہیں کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اتاری گئی ہے، تاوقتیکہ کسی خاص مسئلے کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ فہم قرآن کیلئے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فنِ طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ

دواؤں کے نام، خواص آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا۔ بعینہٖ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائق قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہدیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسباب نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز بھی ہو سکتی تھی، مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے، جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآنِ کریم کے اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا ان غلط تفسیروں کی بہت سی مثالیں ہم نے ایک مقالہ میں جمع کی ہیں جس کو امید ہے کہ جلد شائع کر سکیں گے۔

(۴) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت کی ہے، الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہو گئیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھایا کہ "وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ" وہی چیز دنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہو گی۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بہ موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدتِ طبع دکھائی ہے۔ مثلاً ابن خورک نے حضرت ابراہیم کے قول لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے یا "کملی التعجل للکتب" کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ مجمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا "مرج البحرین" کی تفسیر علی و فاطمہ اور لولو والمرجان کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم یا الصابرین و

الصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین" کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق سے صدیق، قانت سے عمر فاروق، منفقین سے عثمان غنی، مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں[1]۔ ایسی تفسیروں سے سوائے انسانی تخیلات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جاسکتی۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں، بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں، ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں۔ ابوبکر ابن العربی نے ان کی تعداد کو کم کرکے صرف ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اور زیادہ غور کیا تو ان کے خیال میں صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں، مگر وہ بھی منسوخ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم نے تفصیل کے ساتھ ان کے اوپر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کردی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدے نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کردی ہے۔

(۶) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ کی تفسیر میں دس قول ہیں، والفجر ولیال عشر کی متعدد تفسیریں ہیں، وشاھد ومشھود کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ اصحاب الاخدود کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے، یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں یا کرکے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو حزم ویقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلے کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اس لئے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

(۷) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری وحملہ وقتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج وماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ۱۲۰ گز ہوتی ہے

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۴۔

اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اونچا ہے اور دوسرا چھوٹا، اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

یہ سات بڑے بڑے عیوب و اسقام ہیں جو میں نے گنائے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں سے شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو، ان کے علاوہ اگر ان تفاسیر کی چھوٹی چھوٹی جزئی خرابیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ حد و شمار سے باہر ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کو اگر نگاہ بصیرت سے دیکھا جائے تو وہ خود اس قدر مفصل اور مکمل کتاب ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے حقائق کی تفسیر اپنے اندر رکھتا ہے بلکہ اپنے مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح اپنی تعلیمات کی توضیح اور اپنے سمجھنے کے اصول اور قواعد پر بھی مشتمل ہے اور بجز اس کے کہ وہ عربی زبان میں ہے جس کا جاننا اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کسی دوسرے انسانی علم کا محتاج نہیں ہے۔

وہ نور مبین ہے جس کو دیکھنے کیلئے کسی چراغ اور کسی شمع کی حاجت نہیں، اس کی تعلیمات کی تشریح اگر خود اسی کی تفصیلات سے کی جائے تو انسانی اوہام اور اباطیل کی وہ ظلمت جو اکثر کتب تفسیر میں نظر آتی ہے اس کی روشنی میں یکسر کافور ہو جائے، ہم اس یقین پر پہنچ چکے ہیں کہ الفاظ و آیات کے معانی میں جتنے اختلافات رونما ہو سکتے ہیں ان میں فیصلہ کرنے کی پوری طاقت اور حقیقی مفہوم کو متعین کر دینے کی کامل صلاحیت اس میں موجود ہے۔ اس حقیقت کی خود اس نے بار بار تصریح کی ہے، بلکہ یہ بھی وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کی سمجھ میں وہ آئیگا اور کون لوگ ہیں جو اس کی فہم سے محروم رکھے جائیں گے۔ چونکہ ان مباحث کو میں اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں مفصل اور مدلل طور پر لکھ چکا ہوں، اس لئے یہاں ان کو دہرانا غیر ضروری ہے۔

اس پرچہ کے ساتھ

آپ کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔ جنوری کا پرچہ صرف انہی خریداروں کو بھیجا جائیگا جن کا چندہ دسمبر کے مہینے میں وصول ہو جائیگا۔ تفصیل کیلئے "کچھ اپنے متعلق" کا شذرہ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

کچھ اپنے متعلق

نومبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں ہم نے جو "کچھ اپنے متعلق" لکھا تھا اس ضمن میں اکثر احباب کی طرف سے مشورے اور رائیں موصول ہوئیں جن کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ اس وقت تک بات جہاں تک پہنچی ہے اسے ایک مرتبہ پھر دہرا دینا ضروری ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ

(۱) اس پرچہ کے ساتھ تمام خریداروں کا سالانہ چندہ ختم ہو گیا ہے۔ اگر کسی صاحب کے حساب میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو وہ براہ کرم مطلع فرما کر حساب صاف کرلیں، چونکہ بعض اوقات عام خطوط دفتر تک نہیں پہنچتے اس لئے آپ حساب ہی کا خط بذریعہ رجسٹری بھیجئے۔ رجسٹری کے ہر آپ کے حساب میں ہم اپنے ذمہ لے لیں گے۔

(۲) جنوری ۱۹۵۰ء کا پرچہ انہی خریداروں کو بھیجا جائیگا جن کا چندہ دسمبر میں موصول ہو جائیگا، یا جن کی طرف سے حتمی اطلاع آجائیگی کہ چندہ دس جنوری تک موصول ہو جائیگا، جن کی طرف سے دس جنوری تک بھی چندہ موصول نہیں ہوگا انھیں پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔ ہم زائد پرچے چھپوائیں گے ہی نہیں۔ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔

(۳) ڈاکخانہ کا انتظام ابھی تک تسلی بخش نہیں۔ اس لئے زر چندہ بھیجنے کی بہتر یہی صورت یہ ہے کہ آپ کراس چیک بھیجئے۔ اگر آپ کسی ایسی جگہ ہیں جہاں چیک کا انتظام نہیں ہو سکتا، تو ڈاکخانہ کا پوسٹل آرڈر بصیغہ رجسٹری بھیجئے۔

(۴) ہر رقم موصولہ کی چھپی ہوئی رسید ادارہ کی طرف سے بھیجی جاتی ہے۔ اگر پندرہ دن کے اندر رسید موصول نہ ہو تو فوراً ایک خط بصیغہ رجسٹری بھیجئے۔ رجسٹری کے ہر ہم آپ کے حساب میں خرچ کر دیں گے۔

(۵) منی آرڈر کے ذریعے رقم نہ بھیجئے۔ نہ ہی وی پی طلب فرمائیے۔ ہم وی۔ پی نہیں بھیجیں گے۔ سینکڑوں روپوں کی منی آڈر اور وی۔ پی کی رقوم ایسی ہیں جو آپ ادا کر چکے ہیں اور ہم تک نہیں پہنچیں۔

(۶) طلوع اسلام کا سالانہ چندہ دس روپے ہے اور ششماہی چھ روپیہ۔ پرچہ عام ڈاک میں بھیجا جائیگا۔ اگر پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ سے پہلے آجائے تو دوسرا پرچہ اسی ماہ میں بھیجدیا جائیگا اگر اطلاع پندرہ تاریخ کے بعد موصول ہوئی تو پھر اگلے مہینے کے پرچہ کے ساتھ پرچہ بھیجا جا سکے گا۔ اگر دوسری مرتبہ بھیجا ہوا پرچہ بھی آپ تک نہیں پہنچے گا تو سہ بارہ پرچہ نہیں بھیجا جا سکے گا۔

اگر آپ زیادہ احتیاط چاہتے ہیں تو دس روپے کی بجائے تیرہ روپے بھیجئے تاکہ آپ کو ہر پرچہ بذریعہ رجسٹری بھیجا جایا کرے۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے کہ پرچہ ضرور بذریعہ رجسٹری منگائیے۔ صرف احتیاطاً لکھتے ہیں۔

(۷) ایک ایک پرچہ پڑتال کرنے کے بعد ڈاک میں ڈالا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہنچے تو یونہی بدظن نہ ہو جایئے کہ یہ دفتر کی غلطی ہے۔

(۸) اگر آپ طلوع اسلام کی کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے اشتہارات حاصل کیجئے۔

(۹) کراس چیک اور پوسٹل آرڈر پر یہ الفاظ لکھئے۔

"MANAGER TALU-E-ISLAM"

اور لفافہ پر پتہ یہ لکھئے، ادارہ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

(۱۰) پھر سن رکھئے کہ روپے کے معاملہ میں آپ ہمیشہ رجسٹری خط لکھئے۔ رجسٹری کے پیسے ہم آپ کو بھرا دیدیں گے۔ اور جب تک ادارہ کی طرف سے چھپی ہوئی رسید آپ تک نہ پہنچ جائے آپ مطمئن نہ ہوں کہ رقم ہم تک پہنچ گئی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

بابُ المراسلات

عذابِ قبر

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت (بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں شخصیت پرستی کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مُردوں میں شعور اور احساس کچھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ ہماری سنتے ہیں، نہ اس کا علم رکھتے ہیں، انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردے بالکل بے حس رہتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عذاب قبر کیسے ہوتا ہے۔ ہمیں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ جب ہم مُردے کو دفن کر کے واپس آتے ہیں تو مردہ چیختا چلاتا ہے۔ وہ ہمارے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے۔ لیکن ہم اس کی آواز نہیں سن سکتے۔ اتنے

میں قبر میں منکر نکیر آجاتے ہیں۔ مردے سے سوال و جواب ہوتے ہیں، اور پھر نیک لوگوں پر جنت کی کھڑکی کھل جاتی ہے اور گنہ گاروں پر عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ اس زندگی کو حالتِ برزخ کہتے ہیں جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ اس کے متعلق وضاحت سے لکھئے کہ یہ عقیدہ غلط ہے یا صحیح ہے؟

طلوع اسلام قبر کے عذاب کا عقیدہ بھی ان عقائد میں سے ہے جن کی قرآن سے کوئی سند نہیں ملتی اور جو بعد میں اسلام میں داخل کئے گئے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کی قرآن سے سند نہیں ملتی بلکہ قرآن اس کی بصراحت تردید کرتا ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے کافی بحث ہو چکی ہے۔ اتفاق سے اس وقت ہمارے سامنے علامہ اسلم جیراجپوری کی تصریحات موجود ہیں جن سے استفادہ باعثِ اطمینان ہوگا۔

برزخ کا لفظ قرآن میں روک یا آڑ کے معنی میں مستعمل ہے:

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُورًا (۲۵-۵۳)

اور اللہ نے ان دونوں (شور و شیریں سمندر) میں آڑ رکھ دی اور رکاوٹ کی اوٹ۔

دوسری جگہ بجائے برزخ کے حاجز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۲۷-۶۱)

اور اللہ نے دونوں سمندروں میں آڑ رکھ دی ہے۔

تاکہ وہ دونوں اپنے اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۵۵-)

(دونوں (سمندروں) کے درمیان آڑ ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھتے۔

یہی معنی برزخ کے اس آیت میں ہیں:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۱۰۰-)

اور ان (مرنے والوں) کے آگے آڑ ہے اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔

یعنی برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لیکر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہوگا، اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے:

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۵۳)

بس ایک شور ہوگا اور ہمارے پاس وہ سب کے سب حاضر کر دیئے جائیں گے۔

شہدا یعنی مقتولین فی سبیل اللہ جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرمادی ہے وہ برزخ یعنی

آڑ میں نہیں بلکہ "عند ربہم" اپنے رب کی حضوری میں ہیں، جہاں ان کو نئی زندگی مل گئی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی حضوری میں روزی پاتے ہیں۔

یہ عالم برزخ جس میں شہدا کے سوا باقی مُردے رکھے جاتے ہیں، قرآن کے نزدیک مطلق عالم ممات ہے، جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ چنانچہ ان اولیاء اور بزرگان کی نسبت جن کو مشرکین پوجتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶-۲۰)

اور وہ اللہ کے ماسوا جن کو پکارتے ہیں وہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور (اتنی بھی) خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں جن معبودان ماسوی اللہ کا ذکر ہے وہ بت یا شجر یا قمر یا شمس وغیرہ بے جان چیزیں نہیں، کیونکہ ان چیزوں کے لئے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا۔ بلکہ یہ وہی ان کے بزرگانِ دین ہیں جن کو مقبول بارگاہ اور متصرف مان کر وہ پوجتے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ امر اور بھی واضح ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۴۶-۶)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کو جواب نہیں دینے کے، اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔ اور جب لوگ حشر کیلئے اٹھائے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودان غیر اللہ پکارنے والوں کی پکار سے بے خبر ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ معبودان بت وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی بزرگانِ دین اور مقبولانِ بارگاہ ہیں جو قیامت کے دن ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔ کیونکہ بے جان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں ہے۔

تیسری آیت میں انھیں معبودانِ غیر اللہ یعنی بزرگانِ دین کی سماعت کا انکار ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۭ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ (۳۵-۱۴)

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں تم اگر ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور جو سنتے بھی تو جواب دینگے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دینگے۔

اس انکار کی کیفیت قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَاۗءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ شُرَكَاۗؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔ (۱۶-۸۶)

اور جب مشرکین قیامت میں اپنے شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب یہی وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے وہ (شرکاء) ان کو جواب دیں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۔ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۱۰-۲۹)

اور جس دن سب کو ہم جمع کریں گے تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو جاؤ پھر ان کے تعلقات کو ہم منقطع کر دیں گے۔ ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان میں اللہ شہادت کیلئے کافی ہے کہ ہم تمہاری پرستش سے بے خبر تھے۔

ان آیات سے جہاں اس امر کا بین ثبوت ملتا ہے کہ مشرکین کے معبودانِ غیر اللہ ان کے مردہ اولیاء اور بزرگانِ دین ہی ہیں جن کو وہ مقبولانِ بارگاہ اور صاحبانِ قدرت سمجھ کر پوجتے تھے وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے جو برزخ میں ہیں ان میں نہ علم ہے نہ احساس نہ شعور نہ سماعت اور بالکل غافل اور بے خبر ہیں اور قیامت کے دن اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دیدیں گے کہ نہ ہم کو تمہاری پرستش کی خبر تھی نہ تمہاری پکار کی۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھئے۔ قرآن کی رو سے انسان کے لئے دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفار کہیں گے،

اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى

فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (۴۰-۱۱)

(اے رب) تو نے ہم کو دو بار موت دی اور دو بار زندہ کیا۔ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔

یہ اگرچہ کفار کا قول ہے، لیکن حقیقت ہے، کیونکہ سورۂ بقر میں اللہ فرماتا ہے:

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲-۲۸)

تم مردہ تھے اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر وہ تم کو موت دیگا پھر تم کو زندہ کریگا پھر تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

دنیاوی زندگی سے پہلے کی حالت موت سے تعبیر کی گئی ہے جس کے بعد یہ زندگی ملی ہے۔ پھر موت آئے گی، پھر اس کے بعد دوسری زندگی ملے گی جس کے لئے موت نہیں ہے۔ اب یہ دوسری زندگی کس دن ملے گی؟ قبر میں یا حشر کے دن؟ قرآن بتلاتا ہے کہ یہ دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی۔

ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ۔ (۲۳-۱۶)

پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اس لئے یہ متعین ہو گیا کہ دوسری زندگی جو انسان کو ملے گی وہ حشر کے دن ملے گی، نہ کہ قبر میں۔ لہٰذا اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہو جانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور زمانہ چونکہ اعتباری شے ہے اور اہل برزخ میں شعور اور احساس نہیں ہے اس وجہ سے زمانہ کا بھی ان کو احساس نہیں ہے، چنانچہ قیامت کے دن جب وہ اٹھائے جائیں گے تو اپنے خیال میں اپنے آپ کو اسی ساعت اور اسی لمحہ میں سمجھیں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی اور کہنے لگیں گے۔

يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا (۳۶-۵۲)

ہائے ہماری شامت! کس نے ہم کو ہماری خواب گاہ سے اٹھا دیا۔

یعنی حشر کے وقت وہ اپنے آپ کو اپنی خواب گاہ ہی میں سمجھتے ہوں گے، جہاں مرض الموت میں مرے تھے اور ان کو اپنے گاڑے یا جلانے کی بھی خبر نہ ہوگی۔ مرقد کے معنی اس آیت میں قبر کے نہیں ہیں جس میں اردو شعراء اس کو استعمال کرتے ہیں، بلکہ بستر خواب کے ہیں۔ کیونکہ رقاد کے حقیقی معنی نیند کے ہیں۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کے قصہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ (۱۸-۱۸)

اور تو ان کو بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔

الغرض یہ امر قرآن کے نصوص صریحہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ موت اور حشر میں

مردوں کے لئے فصل زمانی نہیں ہے، یعنی ان کو اس برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہوگا اور جب وہ محشور ہوں گے تو اپنے خیال میں اسی ساعت اور اسی لمحہ میں اپنے آپ کو سمجھتے ہوں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ دوسری آیتوں میں زمانۂ برزخ کی مقدار بمنزلہ ایک گھڑی کے بتائی گئی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ۔ (۱۰-۴۵)

اور جس دن اللہ ان کو اٹھائیگا گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ۔ (۴۶-۳۵)

جس دن وہ اس (حشر) کو دیکھیں گے جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے (وہ خیال کریں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی۔

ان کا یہ گمان محض تبدیلیٔ حالت کی وجہ سے ہوگا، ورنہ وہ حقیقت میں ایک گھڑی بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت "يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا" سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں "کان" (گویا) کا لفظ تشبیہ مستعمل ہو رہا ہے، یعنی حقیقتاً تو وہ اپنے علم میں ایک لمحہ بھی برزخ میں نہیں رہے۔ صرف ایسا خیال کریں گے کہ ہم ایک گھڑی رہے ہیں، کیونکہ حالت بدلی ہوئی ہوگی۔

مجرمین جن کی نسبت لوگ سمجھتے ہیں کہ برزخ میں رات دن ان پر گرز کی مار پڑتی رہتی ہے اور آگ میں جلتے رہتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے اوپر یہ مدت برزخ بیمار کی رات کی طرح جو بہت دراز ہوتی ہے کروڑوں سال کی ہونی چاہئے تھی وہ بھی یہی کہیں گے،

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۵۶-۳۰)

اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسم کھائیں گے کہ وہ تو بس ایک گھڑی رہے اسی لئے وہ بھٹکائے جاتے تھے اور جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں رہے قیامت تک۔ سو یہ قیامت کا دن ہے مگر تم نہیں جانتے تھے۔

مجرم تو حشر کے دن قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے مگر اہل علم و ایمان ان سے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے، لیکن تم کو خبر نہ تھی۔ یہ تصریح ہے ان کے عدم احساسِ زمانی کی۔ خود ان مومنوں کو بھی احساس نہ تھا، جیسا کہ ہم اوپر کی آیتوں سے ثابت کر چکے ہیں، مگر اپنی یوم البعث پر عقیدہ رکھنے کے باعث وہ قیامت کے دن کو پہچان لیں گے اور کہنے لگیں گے کہ برزخ

کی طویل مدت تم پر گزر چکی ہے مگر تم کو علم نہ تھا۔

ہماری یہ تمام بحث انسانی جسم کے متعلق نہیں ہے جو سڑ کر اور گل کر عناصر میں مل جاتا ہے بلکہ اس کی روح کے متعلق ہے۔ عالم برزخ میں روح کی بقا کے متعلق جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اس کا علم اللہ کے نوشتہ میں ہے، جیسا کہ آیت بالا میں اہل ایمان و علم کے قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری آیت ہے:

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ۔ (۲۰-۵۲)

فرعون نے پوچھا کہ گذشتہ نسلوں کی کیا حالت ہے موسیٰ نے کہا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس نوشتہ میں ہے۔

اس کی تصریح پارۂ عم میں ہے:

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّیْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ (۸۳-۹)

گنہگاروں کا اندراج سجین میں ہے اور تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ (۸۳-۲۱)

نیکو کاروں کا اندراج علیین میں ہے اور تجھے کیا معلوم کہ علیین کیا ہے وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اسی کو سابقہ آیات میں لبث فی کتاب اللہ کہا گیا ہے جس سے مراد قیام برزخ کی مدت ہے۔ دوسرا لفظ لبث فی الارض ہے جس سے مراد روئے زمین پر رہنے کی مدت یعنی دنیاوی زندگی ہے۔ اس کا بھی قیامت کے دن سوال ہوگا۔ اس کے جواب میں لوگ ایک گھڑی نہیں بلکہ ایک دن کہیں گے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَاسْـَٔلِ الْعَآدِّیْنَ۔

اللہ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے کہ ایک دن یا اس سے بھی کم ان لوگوں سے پوچھ جو شمار رکھتے تھے۔

دوسری آیت میں دس دن کا بھی ذکر ہے:

یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا۔ (۲۰-۱۰۵)

وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس دن۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے جو سب سے زیادہ روبراہ ہوگا وہ کہے گا کہ تم تو صرف ایک دن رہے۔

ان تمام تفصیلات کے بعد ہم حسب ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں جو قرآن کریم سے تصریحاً ثابت ہوئے:

۱۔ عالم برزخ عالم ممات ہے جس میں نہ مردوں میں شعور ہے نہ احساس نہ علم، نہ سمع، نہ حیات کا کوئی شائبہ۔

۲۔ انسان کے لئے دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں۔ پہلی زندگی یہ دنیوی زندگی ہے اور دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی۔ برزخ میں زندگی نہیں ہے۔

۳۔ اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے، اس لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ مرنے والے کے لئے

موت ہی کا دن اس کے حشر کا دن ہے۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے برزخ میں عذاب یا ثواب کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں عذاب یا ثواب کا ذکر ہے وہاں صرف دنیاوی اور اُخروی عذاب و ثواب کا ذکر ہے۔ برزخ کا کہیں نام تک نہیں آیا ہے۔

سینکڑوں آیتیں مختلف قسم کے مجرموں کے عذاب کے متعلق ہیں، مگر کسی میں سوائے دنیا اور آخرۃ کے عذاب کے، برزخ کے عذاب کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور ہو کیسے جبکہ نہ برزخ میں حیات کا کوئی شائبہ ہے نہ زمانہ، نہ عذاب و ثواب سے اثر پذیری کی کوئی صلاحیت۔ یہی وجہ ہے کہ بجز ان چند انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جن کی جزا یا سزا لازمی طور پر دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور جن کی تصریح آیاتِ قرآنی میں کر دی گئی ہے قرآن کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ دارالجزا آخرت ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (۱۶-۶۱)

اور اگر اللہ لوگوں کا ان کے گناہوں پر مواخذہ کرنے لگتا تو زمین میں کوئی جاندار نہ چھوڑتا، لیکن اس نے لوگوں کو ایک وقت مقررہ تک مہلت دے رکھی ہے۔

یہ "اجل مسمیٰ" کون سا دن ہے؟ اس کی تصریح کئی جگہ قرآن میں کر دی گئی ہے:

بِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (۷۷-۱۲)

کس دن کیلئے مہلت دی گئی ہے فیصلہ کے دن کے لئے۔

یہ فیصلہ کا دن قیامت کا دن ہے:

وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ۔ (۳۷-۲۰)

اور کافر کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت! (انصاف کا دن ہی (یہاں) یہی وہ فیصلہ کا دن ہے جسکو تم جھٹلاتے تھے۔

اس لئے دنیا کے بعد حساب و کتاب و عذاب کا دن قیامت ہی کا دن ہے، برزخ نہیں ہے۔ یہاں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے، یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے حضرت نوحؑ کا انکار کیا، وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب میں ہے اور برزخ میں جلے اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا، وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔ قرآن کی رو سے دونوں کے فیصلے کا ایک ہی دن مقرر ہے۔ اسی دن ان کے اعمال نامے نکالے جائیں گے اور حساب و کتاب ہوگا اور جزا و سزا دی جائے گی۔ برزخ کے زمانے کا دونوں میں سے کسی کو احساس نہ ہوگا۔

اب میں اُن چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں، جن سے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے:

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (۱۶-۳۲)

جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو، تم جنت میں داخل ہو، ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت خاص دارِ آخرت کے متعلق ہے، برزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کا سلسلۂ بیان یہ ہے ا

وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (۱۶-۳۲)

اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا، ہمیشہ رہنے والے باغات میں وہ داخل ہوں گے، جن کے نیچے بہتی نہریں ہوں گی ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے ان کو وہ ملے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پرہیزگاروں کو بدلہ دیگا جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں جبکہ وہ پاک تھے۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو اپنے عمل کے بدلے جنت میں چلو۔

دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذابِ برزخ کا خیال ہوا ہے یہ ہے:

وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ۔ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ۔

اور آلِ فرعون کو برے عذاب آگ نے گھیر لیا جس پر وہ صبح اور شام پیش کئے جائیں گے اور قیامت کے دن کہا جائے گا کہ آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آلِ فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح اور شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں یہ عذابِ برزخ ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔

یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں، کیونکہ اگر برزخ میں آلِ فرعون روزانہ صبح و شام کو آگ پر پیش کئے جاتے ہیں تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور و احساس بھی ہونا چاہئے، جن کا قرآن تصریحاً انکاری ہے اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ یہ دراصل ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ "یعرضون" کے معنی بیانِ حال کے لئے گئے ہیں، یعنی "وہ پیش کئے جاتے ہیں"۔ حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں، کیونکہ کفار جن میں آلِ فرعون بھی شامل ہیں، ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ (۴۶-۲۰)

اور جن کو کفار آگ پر پیش کئے جائیں گے (ان سے کہا جائیگا) کہ تم اپنی لذتیں اپنی دنیوی زندگی میں اٹھا چکے۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ آگ پر پیشی دوسری زندگی میں ہوگی جو حشر کے دن ملے گی۔ چنانچہ سورۂ ہود میں اس کی تصریح موجود ہے:

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ - (۱۱-۹۸)

فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئے گا قیامت کے دن اور ان کو آگ میں اتاریگا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ برزخ کا فیر زمانی ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں۔ اس میں نہ صبح ہے نہ شام، اور اس آیت میں غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے بجنسہٖ اسی طرح جس طرح جنت کیلئے بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی مفسرین اور اہل لغت نے دوام کے لکھے ہیں:

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا - (۱۹-۶۲)

اور جنتیوں کو ان کی روزی اس میں صبح و شام ملتی رہے گی۔

جو صبح اور شام جنت میں ہے وہی دوزخ میں ہوگی، خواہ اس کے معنی دوام کے لئے جائیں یا کچھ اور۔ اب اس طرح آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنی آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب جو دیا جائے گا وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت عذاب میں ڈال دو:

وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوحِينَ - (۲۸-۴۲)

اور ہم نے اس دنیا میں آل فرعون کے پیچھے لعنت لگادی اور قیامت کے دن وہ برے حال میں ہوں گے۔

دنیا میں ان کے ملعون اور قیامت میں مقبوح ہونے کی تصریح کی گئی ہے مگر برزخ کا نام نہیں لیا گیا۔

اصلیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جا بجا موت کے ساتھ ہی ساتھ عذاب یا ثواب کا ذکر جو آتا ہے وہ قیامت کے دن کا عذاب یا ثواب ہے، برزخ کا نہیں ہے، کیونکہ موت اور قیامت میں مُردوں کے لحاظ سے فصل زمانی نہیں ہے۔ لوگوں کی نظر چونکہ اس نکتہ پر نہ تھی، اس وجہ سے انھوں نے عام اعتقاد کے مطابق اس عذاب یا ثواب کو موت کے بعد یعنی برزخ کا سمجھ لیا۔

جو حال آل فرعون کا ہے بجنسہٖ وہی حال قوم نوحؑ کا ہے، یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کئے جائیں گے:

اُغْرِقُوا فَاُدْخِلُوا نَارًا - (۲۵)

وہ غرق کئے گئے اور آگ میں داخل کر دیے گئے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں جنت کے ثواب اور جہنم کے عذاب کے متعلق جا بجا ماضی ہی کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں، کیونکہ اللہ جو زمانہ سے بری ہے، اس کے سامنے یہ سب واقعات

حاضر ہیں۔ مثلاً حشر کے متعلق ہے،

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا۔ (۱۴-۲۱)

اور وہ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور کمزوروں نے ان لوگوں سے کہا جو بڑے بنتے تھے۔

یا جہنمیوں کے بارے میں ہے:

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ۔ (۲۲-۲۰)

جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے آگ کے کپڑے تر شوائے گئے۔

یا جنتیوں کے متعلق ہے:

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ (۳۷-۵۱)

جنتیوں میں سے ایک دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے رُخ کیا۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا۔

اس لئے قوم نوح کے متعلق جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں، یہ قیامت کے دن کیلئے ہیں، کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب وکتاب اور عذاب وثواب کے دن کی تصریح کردی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے، لہٰذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں۔

تیسری آیت جو برزخ کے عذاب کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے یہ ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا۔ (۶-۹۴)

اور تو دیکھتا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنا ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال دو، آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمہارے امور میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔

اس آیت میں الیوم کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے مگر جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے اور موت اور قیامت کے دن میں مردوں کے لحاظ سے فصل نہیں، تو یہ آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں اول مرۃ (جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا) کا لفظ صاف تصریح کر رہا ہے کہ یہ حیات اخروی کا واقعہ ہے۔ دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ حشر کی تصریح کردی گئی:

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۸-۴۸)

اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور (ان سے کہا جائیگا) کہ تم ہمارے پاس آگئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس میں باوجود اس کے کہ سارے صیغے ماضی کے مستعمل ہوتے ہیں تصریح کی گئی ہے کہ یہ سوال و جواب حشر کے دن کا ہے۔

الغرض قرآن کریم سے عذاب یا ثواب برزخ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ حدیث کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میرے پاس مدینہ کی دو یہودی بڑھیا عورتیں آئیں، انھوں نے کہا کہ قبر میں مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔ میں نے ان کو جھٹلایا، جب وہ دونوں چلی گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو یہ بات میں نے آپ سے ذکر کی۔ فرمایا کہ ہاں ان دونوں عورتوں نے سچ کہا، مردوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے جس کو سارے چوپائے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلعم ہر نماز کے بعد عذابِ قبر سے پناہ مانگتے تھے، یعنی اس وقت تک رسولِ عظیم عذابِ قبر سے خالی الذہن تھے۔ ان یہودی عورتوں کے کہنے سے خیال پیدا ہو گیا۔

یہ اور اسی قسم کی اور حدیثیں ہیں جن سے اس عقیدہ کی تخلیق ہوئی ہے۔

چونکہ مستفسر نے صرف عذابِ قبر (یا عالمِ برزخ) کے متعلق ہی سوال کیا ہے اس لئے ہم نے جواب کو بھی اسی حد تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ اصل سوالات تو یہ ہیں کہ قرآن کے نزدیک حیات کسے کہتے ہیں، موت کے کیا معنی ہیں؟ قیامت کا تصور کیا ہے؟ عذاب و ثواب سے کیا مفہوم ہے؟ جنت اور دوزخ سے کیا مقصود ہے؟ نجات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ وقس علی ہذا۔ مسلمان کو چونکہ اس زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا (کہ زندگی سے واسطہ زندوں کو ہوا کرتا ہے، مُردے کیا جانیں کہ زندگی کسے کہتے ہیں) اس لئے اس نے ان تمام سوالات کو قیامت تک ملتوی کر رکھا ہے۔ اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئے گی۔ وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جو اس کی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے اور اس جنت و دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے جس میں قوموں کے اعمالِ حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں اور نہ ہی اس عذاب اور ثواب پر نگاہ رکھتا ہے جو اس کی زندگی ہر ثانیہ متاثر کئے جا رہا ہے۔ یہ ہیں وہ سوالات جو زندگی کے حقائق سے براہِ راست متعلق ہیں۔ لیکن مسلمان حقائق کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا کہ ان حقائق کے آئینے میں اسے اپنی تصویر ایسی بھیانک دکھائی دیتی ہے جس سے اس کی چیخیں

نکل جاتی ہیں۔ اس لئے اس نے اسی میں عافیت سمجھ رکھی ہے کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ گویا آنکھیں بند کر لینے سے حقائق معدوم ہو جائیں گے۔

بہرحال یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ مردوں میں نہ شعور ہوتا ہے نہ احساس، نہ وہ ہماری سنتے ہیں، نہ اس کا کچھ علم رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمان نے زیر زمین ایک دنیا بسا رکھی ہے اور اس موجودہ دنیا کا سارا نظم نسق، زیر زمین مردوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ ساری دنیا "مردہ بدست زندہ" کی قائل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک تمام زندہ انسان مُردوں کے بس میں ہیں۔ یہی مُردے (غوث، قطب، ابدال، اولیاء وغیرہ) نظام عالم کے مختار کار ہیں اور محکمۂ قضا و قدر کے مالک۔ جب زندہ انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ان مردوں سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ وہ ان کے حضور جا کر روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، فریادیں کرتا ہے۔ ان سے داد رسی چاہتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ مردے اس کی تقدیریں بدل دیں گے۔ غور کیجئے کہ جو زندہ انسان، اپنی تقدیریں مُردوں سے بدلوائیں، ان سے بڑھ کر موت بھی کسی اور پر طاری ہو سکتی ہے؟ فطرت انھیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر آگاہ کرتی ہے کہ تمہاری کیوں مت ماری گئی ہے۔ لیکن یہ (بظاہر) زندہ (درحقیقت) ایسے مردہ ہیں کہ انھیں فطرت کی تنذیر سے بھی آگہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ بڑی بڑی درگاہیں اور خانقاہیں، جنھیں یہ اپنے عقیدہ میں تمام قوتوں کا مرکز سمجھا کرتے تھے اور اپنی تمام مرادوں کا ملجا و ماویٰ، ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں کس بری طرح سے پامال ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ قبریں نہ صرف یہ کہ اپنے معتقدین ہی کی حفاظت نہ کر سکیں بلکہ اپنے آپ کو بھی بچا نہ سکیں۔ آج ان سب درگاہوں پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ ہے اور وہ انھیں جس طرح جی چاہے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان کی آنکھ میں ذرا سی روشنی بھی باقی ہوتی تو وہ دیکھتا کہ جنھیں میں اتنی بڑی قوتوں کا مالک سمجھا کرتا تھا وہ کس قدر بے بس نکلے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نورِ بصیرت کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی۔ اس نے ان قبروں کے مُتَولّی یہاں بنانے شروع کر دیئے ہیں اور اب ان کے حضور سجدہ ریزی ہونے لگ گئی ہے!

کوئی سا پتھر ہو، مطلب تو سر پھوڑنے سے ہے!!

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد، کوہکن است

نقد و نظر

(۱) ماہنامہ چراغِ راہ کراچی کا قیادت نمبر

"چراغِ راہ" اسلامی جماعت کا نقیب ہے۔ حکومتِ کراچی نے سینٹی ایکٹ کے ماتحت چھ ماہ کے لئے اس کی اشاعت روک دی تھی، اب اس نے پہلا پرچہ، قیادت نمبر شائع کیا ہے۔ چراغِ راہ کے مرتب نعیم صدیقی صاحب کو اللہ نے اچھا قلم عطا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں شگفتگی ہوتی ہے جو مولویوں کے طبقہ میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

مسلم لیگی قیادت کے متعلق، تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد، اسلامی جماعت کا مسلک اور طرزِ عمل محتاجِ تعارف نہیں۔ زیرِ نظر قیادت نمبر اسی مسلک اور اسی قسم کی تنقید پر مشتمل ہے۔

اسلامی جماعت کے موقف، مسلک اور منہاج کے متعلق، طلوعِ اسلام میں اس سے قبل اکثر مرتبہ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے قارئین طلوعِ اسلام اس باب میں ہمارے نقطہ نگاہ سے بھی واقف ہیں۔ لیکن ان تمام تصریحات کے باوجود، یہ سوال اکثر دہرایا جاتا ہے کہ جب طلوعِ اسلام بھی اسلامی نظام کا داعی اور مبلغ ہے۔ اس کی شروع سے یہی پکار چلی آتی ہے کہ ہر وہ نظام معاشرت و حکومت جو غیر قرآنی خطوط پر تشکیل ہے، طاغوتی نظام ہے۔ اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کی موجودہ قیادت پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور ان کے ہر مذموم فیصلہ پر کڑی سے کڑی تنقید کرتا ہے۔ اور یہی کچھ اسلامی جماعت کا مسلک و عمل ہے۔ تو پھر طلوعِ اسلام، اسلامی جماعت کا ہم مسلک و ہم نوا کیوں نہیں بنتا؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس سوال کا جواب اس سے پیشتر کئی مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس سوال کو بار بار ہمارے سامنے لایا جاتا ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قیادت نمبر پر تبصرہ کے ضمن میں، اس موضوع پر ایک مرتبہ پھر مختصر انداز سے گفتگو کی جائے۔

طلوعِ اسلام کی اسلامی نظام کی طرف دعوت کسی تشریح و تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کا وجود ہی اس مقصدِ عظیم کے لئے عمل میں آیا ہے۔ باقی رہی موجودہ قیادت پر اس کی تنقید، سو اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چراغِ راہ کے زیرِ نظر قیادت نمبر میں، خود طلوعِ اسلام کا ایک پورا مضمون بہ تبدیلی عنوان شامل ہے لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو اسلامی جماعت سے اختلاف ہے۔ یقیناً یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے، اور اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ اس وجہِ اختلاف کو ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کی قوم یکسر جذباتی قوم بن چکی ہے۔ اسی کو ہم دوسرے الفاظ میں شاعروں کی قوم کہا کرتے ہیں۔ یہ پوری کی پوری قوم شاعروں کی قوم ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں شاعری کرتی ہے۔ شاعری سے مراد یہ نہیں کہ یہ شعر کہتی ہے اور نظمیں لکھتی ہے، بلکہ یہ کہ زندگی کے ٹھوس حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے، یہ قوم جذبات کی دنیا میں مست ہے۔ اس میں سنجیدہ فکر اور متین تدبر کی صلاحیت نہیں رہی۔ اس کا دماغ، مجلہ حیات کا "افسانہ نمبر" بن چکا ہے۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ واقعات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، زندگی کے تقاضے کیا کہہ رہے ہیں، دنیا کی قومیں کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہیں، ان میں ہمارا مقام کیا ہے اور ہم اس مقام پر کیوں ہیں! انھیں ان سوالات سے کچھ غرض نہیں۔ انھیں زندگی کے ان تقاضوں اور وقت کے ان مطالبوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ حالت ہمیشہ اس قوم کی ہوتی ہے جن میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی ہو جن کے قوائے عملیہ مفلوج و مشلول ہوں۔ زندگی کے ٹھوس حقائق، عمل کے مقتضی ہوتے ہیں۔ عمل سے عاری قومیں اپنے آپ کو جذبات کی افیون سے فریب دے لیتی ہیں۔ اس افیونی فریب میں مذہب کا غلط تصور، جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

جذبات کی افیون خوردہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینا بڑا آسان ہوتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں رہنے والی قوم، ہر پکارنے والے کی پکار کو نتائج سے پرکھتی ہے۔ وہ صرف اسی کی سنتی ہے جس کی آواز کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے لے آئے۔ وہ اسی کے پیچھے چلتی ہے جو ان کی مشکلات کا عملی حل ان کے سامنے رکھ دے۔ اس کے برعکس جذبات زدہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینے کے لئے، چند ولولہ انگیز نعروں، چند حسین ترکیبوں، چند نگاہ فریب نظریوں اور چند خوش آئندہ وعدوں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور چونکہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس فریب خوردگی میں مذہب کے غلط تصور کو سب سے بڑا دخل ہوتا ہے، اس لئے ان خوش آئند نظریوں اور نگاہ فریب وعدوں کو اگر مذہب کے رنگ میں رنگ دیا جائے تو اس طلسم ہوش ربا کی کامیابی میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ یہی وہ آسان راستے ہیں جن سے ہر رہزن سبک پا آتا ہے اور ان کی متاعِ دین و دانش کو نہایت اطمینان سے لوٹ کر لے جاتا ہے اور انھیں خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نہیں! اتنا ہی نہیں کہ انھیں خبر نہیں ہونے پاتی، بلکہ یہ افیون ان کی نگاہ کے زاویوں کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ یہ رہزن کو مشفق اور قزاق کو سب سے زیادہ ہمدرد سمجھتی ہے۔ ان رہزنوں کے علاوہ، جو دیدہ دانستہ، ان کے متاعِ ملی کو غصب کرتے ہیں، ایک طبقہ نادان دوستوں کا بھی ہوتا ہے جو ان کی جذباتی افیون کو تیز سے تیز کرتا رہتا ہے اور انھیں کبھی ہوش میں نہیں آنے دیتا۔

یوں تو ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، لیکن سردست ہمارے پیشِ نظر صرف ہندوستان (اور اب پاکستان) کے مسلمان ہیں۔ ان کی گذشتہ ایک سو سال کی تاریخ پر نگاہ

ڈالئے اور سوچئے کہ ان دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کس بری طرح ان کے جذبات کو لوٹا اور کھسوٹا ہے۔ سوچئے اور بارِ دگر سوچئے کہ ان کے سفرِ حیات میں کتنے ایسے مقام آئے ہیں جہاں چند نعروں سے مدہوش کرکے، پوری کی پوری قوم کو تباہ کرا دیا گیا۔ سوچئے کہ ان کی سو سال کی مختلف تحریکوں کا ما حصل کیا رہا ہے؟ یہ سیماب پا قوم چند گرم گرم نعروں کی حرارت سے کس طرح بگولے کی طرح اٹھتی رہی ہے اور اس کے بعد کس بری طرح آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی رہی ہے۔ غور کیجئے کہ اس کے اس قسم کے جوش و خروش کا ردِ عمل کیا ہوتا رہا ہے۔ ان ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں کو بھی چھوڑیئے اور اسے دیکھئے کہ مذہب کے غلط تصور نے ان کی زندگی کے تمام حرکات و سکنات کو کس درجہ بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ خود ہی سوچئے کہ مذہب کے غلط تصور کے جس فریب میں قوم کو مبتلا رکھا جا رہا ہے، اسے ان کی تباہی اور بربادی میں کتنا بڑا دخل ہے!

یہ ہے مسلمانوں کی وہ جذبات زدہ قوم، جسے ہر وہ شخص جو چند فقرے لکھنا یا چند الفاظ بولنا جانتا ہو، نہایت آسانی سے اپنے پیچھے لگا لیتا ہے۔ نہیں! بلکہ اکثر اوقات ان متبوعین کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ لکھنا اور بولنا بھی جانتے ہوں۔ اس بھولے شکار کے لئے تو تراش خراش کے مخصوص انداز اور وضع قطع کے خاص اسلوب کا جال اور دانہ ہی کافی ہے۔ یاد رکھئے! اس قسم کا مسیحا ہی خواہ وہ ہو سکتا ہے جو اسے جذبات کی دنیا سے نکال کر دوا ور دو چار کہنا اور سمجھنا سکھائے اور الفاظ کا مفہوم نتائج سے پرکھنا بتائے۔ ہمیں اس کا خوب احساس ہے کہ جذبات کے بعد یہ دنیا مشین رہ جاتی ہے اور عمل جذباتِ صحیحہ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جذبات کی جس افراط میں ہماری قوم مبتلا ہے اس کا علاج یہی ہے کہ ان سے یہ افیون کسی طرح سے چھڑا دی جائے۔ سرسام کا علاج، سر پر برف رکھنا ہوتا ہے۔ جب درجۂ حرارت اعتدال پر آ جائے، پھر آپ گرم اور سرد دونوں قسم کی فضاؤں میں رہ سکتے ہیں۔ اس وقت قوم سرسام زدہ ہو رہی ہے۔ اسے جذبات سے الگ کرکے حقائق کا سامنا کرنے کا خوگر بنانا از بس ضروری ہے۔ اس سو سال کے عرصہ میں ایسے دیدہ ور بھی گذرے ہیں جنہوں نے قوم کے اس مرض کا صحیح اندازہ کیا اور انہیں حقائق سے دوچار ہونے کی دعوت دی۔ ہماری گردنِ تشکر ان کے اس احسان کے احساس سے خمیدہ ہے۔ ہمیں اس وقت ان تمام صاحبانِ فکر و عمل کا تذکرہ مقصود نہیں۔ صرف اس آخری چارہ گر کی طرف اشارہ منظور ہے جس کی نگہ دوربیں اور حقائق پسندی کی وجہ سے ہم آج اس قابل ہیں کہ ایک خطۂ زمین پر خدا کے احکام نافذ کر سکنے کا امکان پاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ سنہ ۱۹۱۲ء سے آگے چل کر مسلمانوں کی سیاست کس طرح جذبات کی تلاطم انگیزیوں میں بہی چلی جا رہی تھی اور ہندو ان کی اس مدہوشی سے کس طرح فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ قوم کی خوش بختی تھی کہ عین اس وقت فکرِ اقبال کی شمع قائدِ اعظم (مرحوم و مغفور) جیسے مرد آزما ہاتھوں میں آ گئی۔ جذبات

کی شرانگیزیاں ان کی فطرت کے خلاف تھیں۔ وہ حقائق کا سامنا، جذبات سے یکسر الگ ہو کر کیا کرتے تھے
ان کی وہ سالہ بساطِ سیاست پر غور کیجئے۔ اس میں ایسے ایسے مقام آئے کہ ان کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو یقیناً
جذبات کی سیلِ بے پناہ میں بہہ جاتا۔ ہندو یہی چاہتا تھا۔ لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ فطرت نے انہیں مزاج
ہی ایسا دیا تھا کہ ان کی فکر کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں جیسی سراپا ارتعاش قوم کو جذبات
کی شعلہ فشانیوں سے نکال کر حقائق کی دنیا میں لے آئے۔ یہی ان کا وہ کمالِ سیاست تھا جس کے سامنے ہندو
کو قدم قدم پر زک اٹھانی پڑی۔

لیکن عین اس وقت جب وہ مردِ فرزانہ، قوم کو اس طرح جذبات کی شرانگیزیوں سے نکال کر،
واقعات کی ٹھوس دنیا میں لا رہا تھا، اسلامی جماعت وجود میں آئی اور اس نے مسلمانوں کے انہی جذبات
سے پھر کھیلنا شروع کر دیا جن میں وہ اتنے عرصے سے الجھی چلی آرہی تھی۔ جناح کی قیادت بے دینی قیادت ہے،
یہ نماز نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، ڈاڑھی منڈاتا ہے، سوٹ پہنتا ہے، اسے مذہبی معلومات نہیں وغیر ذالک۔
یہ تھے وہ "سلوگن" جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ہوا دی گئی۔

جناح کو کبھی مذہب پرستی کا دعویٰ نہیں تھا۔ اس کے حامیوں نے (بہر حال طلوع اسلام اپنے
متعلق پورے حتم ویقین سے کہہ سکتا ہے) اُسے کبھی مذہبی پیشوا نہیں مانا۔ سوال ایک سیدھا سا سامنے تھا۔
ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ تھا کہ پورے ملک پر اس کی اکثریت کی حکومت رہے۔
اس حکومت کے تابع، مسلمانوں کا جو حشر ہو سکتا تھا اس کی زندہ شہادت، ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں
کی حالت ہے۔ جناح کا مطالبہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے کم از کم ان علاقوں میں تو ان
کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ یہ تھی جناح کی "قیادت"۔ ذرا سوچئے کہ اس مطالبہ میں جسے جناح نے پیش
کیا تھا، کوئی چیز "غیر دینی" بھی تھی؟ لیکن جناح یہ مطالبہ پیش کر رہا تھا، اور عین اس وقت جب ہندو کی یہ
انتہائی خواہش تھی کہ جناح کے اس مطالبہ کے خلاف خود مسلمانوں کی طرف سے آوازیں اٹھیں اسلامی
جماعت تھی کہ مسلمانوں کے جذبات کو یہ کہہ کر جناح کے خلاف ابھار رہی تھی کہ اس کی قیادت غیر دینی ہے
اس لئے اس کا ساتھ نہ دو۔

اب آپ یہ سوچئے کہ اگر اس وقت ان کی آواز پر مسلمان کان دھر دیتے اور ان کے کہنے میں آکر
جناح کا ساتھ چھوڑ دیتے تو آج ان چھ سات کروڑ مسلمانوں کا حشر کیا ہوتا جنہیں پاکستان میں سر چھپانے
کو جگہ مل گئی ہے! اور مسلمانوں کو چھوڑیئے۔ خود جماعت اسلامی سے پوچھئے کہ اگر (خدانخواستہ) یہ کامیاب ہو جاتے
تو وہ سرزمین کہاں ہوتی جس پر یہ اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت دے رہے ہیں! یہ زمین جس پر آپ مسجد
بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اسی "غیر صالح قیادت" کی کوششوں کا نتیجہ ہے جسے ناکام کرنے کے لئے آپ

اس وقت مسلمانوں کو ابھار رہے تھے! طلوعِ اسلام اس وقت پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خدا کیلئے مسلمانوں کے جذبات کو ابھار کر انھیں غلط راہوں پر نہ لگاؤ۔ وقت بڑا نازک ہے۔ اس وقت اگر تم جناح کی ڈاڑھی کا سوال لیکر بیٹھ گئے تو چند ہی دنوں کے بعد پوری کی پوری قوم کی ڈاڑھی منڈ جائیگی۔ خود جماعتِ اسلامی کے امیر اپنی امارت سے پہلے تمام عمر ڈاڑھی منڈاتے رہے ہیں۔ اگر ان کی اس زمانہ کی پیش کردہ فکر "بے دین" فکر نہ تھی تو جناح کی کوششوں کو "بے دین" قیادت کی کوشش کیوں کہتے ہو۔ خدا کے لئے حقائق کو سامنے رکھو۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کے مستقبل کو خطرہ میں مت ڈالو۔

یہ تھی اس وقت وجہِ اختلاف اسلامی جماعت سے طلوعِ اسلام کی۔ آپ خود سوچئے کہ اس اختلاف میں طلوعِ اسلام کس حد تک حق بجانب تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اسلامی جماعت کی اس وقت نیت کیا تھی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کی نیت تخریب کی تھی تو یہ غدار قوم تھے اور اگر نیت اصلاح کی تھی تو ان میں سیاست سمجھنے کی ذرا بھی صلاحیت نہ تھی۔ صورتِ حالات وہ تھی یا یہ، دونوں صورتوں میں نتیجہ قوم کے لئے ہلاکت تھا۔

اب تقسیمِ ہند کے بعد کے زمانہ کی طرف آیئے۔ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ تقسیمِ ہند کے ضمن میں کس سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ جزئیات کے تعین میں جناح سے بھی غلطیاں ہوئیں۔ جناح بالآخر انسان تھے۔ ہم انھیں معصوم عن الخطا نہیں مانتے۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ غلطیاں یا ان کے عواقب اس لئے ظہور میں آئے کہ جناح کی قیادت غیر دینی تھی، پھر وہی جذبات انگیزی اور حقائق سے چشم پوشی ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تدبر صحیح نہیں تھا، اندازے غلط تھے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ جناح کے ڈاڑھی نہیں تھی اس لئے یہ غلطیاں ہوئیں۔ اگر قیادت ڈاڑھی والوں کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ اس بحث کو بھی چھوڑیئے کہ اگر قیادت، جماعتِ اسلامی کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ غلطیاں ہوتیں یا نہ ہوتیں، یہ بحث بعد از وقت ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ جناح کی "غیر دینی قیادت" پاکستان کا مطالبہ کرتی تھی اور جماعتِ اسلامی کی "دینی قیادت" اس کی مخالفت کرتی تھی۔ یہ فرمایئے کہ اس اصولی بات میں وہ "غیر دینی قیادت" صحیح راستہ پر تھی یا آپ کی "دینی قیادت"! جیسا کہ ہم نے پچھلے سال لکھا تھا، اگر اسلامی جماعت کی مخالفتِ مطالبۂ پاکستان ان کی دینداری پر مبنی تھی تو ان کے لئے صحیح راہِ عمل یہ تھی کہ وہ اس پاکستان میں قدم نہ رکھتی۔ پاکستان کو وہ "زہر ملا ہوا حلوہ" کہکر پکارا کرتے تھے۔ وہ اسے لادینی قیادت کا ثمرہ قرار دیا کرتے تھے۔ ایک دینی جماعت کیلئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس قسم کی سرزمین کی طرف رخ بھی کرتی۔ جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ وحدتِ ہندوستان میں، ہندو اکثریت، مسلمانوں پر حکومت کریگی تو اس کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ

اگر مسلمانوں کا کردار درست کر دیا جائے تو یہ اقلیت میں رہتے ہوئے بھی حکمران ہو سکتے ہیں۔ ہم نے سال گذشتہ یہی کہا تھا کہ اگر اسلامی جماعت کا یہ دعوے اخلاص پر مبنی تھا تو انھیں چاہئے کہ ہندوستان میں جا کر مسلمانوں کے کردار کی درستگی کی کوشش کریں تاکہ وہ اقلیت میں رہتے ہوئے حکمران بن جائیں۔ لیکن ان مدعیانِ انقلاب صالحہ میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ ادھر کا رخ بھی کرے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جو پاکستان "غیر دینی قیادت" کا حاصل کردہ ہے، جو پاکستان ان کوششوں کا ثمرہ ہے جن میں تعاون آپ کے نزدیک تعاون علی الاثم والعدوان تھا، اس پاکستان میں پناہ لینا کون سے دین اور تقویٰ کی رو سے جائز ہے؟ کیا غصب کردہ زمین پر "مسجد" بنانا جائز ہو سکتا ہے؟ آپ نے مسلمانوں کیلئے جو راہِ عمل تجویز کی تھی وہ اس منزل کی طرف لے جاتی تھی جس میں آج ہندوستان کا مسلمان ہے۔ چونکہ وہ راہ، آپ کے نزدیک حق و صواب کی راہ تھی اس لئے آپ کا مقام بھی وہی ہونا چاہئے نہ کہ یہ۔ لیکن آپ صرف پاکستان میں پناہ ہی کے طالب نہیں، اس سرزمین کو اپنے اقتدار میں لینے کے بھی خواہاں ہیں۔ بالآخر کسی خصوصیت کی بنا پر؟ آپ کی سیاست دانی کا ثبوت تو پاکستان کی مخالفت سے ظاہر ہے اور آپ کی صالحیت کا ثبوت یہ کہ وہی پاکستان جسے آپ زہر ملا حلوہ کہا کرتے تھے، وہ اب شیر مادر قرار دیا جا رہا ہے!

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی جماعت میں بہت سی ایسی سعید روحیں بھی شامل ہیں جو نہایت نیک نیتی سے مسلمانوں کے اصلاح حال کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ ان سعید روحوں کو ہماری یہ تنقید یقیناً ناگوار گذرے گی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک حقائق کو بیکسر بے نقاب نہ پیش کیا جائے، حقیقت سامنے نہیں آسکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جذباتِ صالحہ سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہم ان حضرات سے باادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنی جذباتی عقیدت مندی سے ذرا الگ ہو کر سوچیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مبنی علی الحقیقت ہے یا نہیں۔ ہمیں جماعتِ اسلامی کا فریقِ مقابل بننے سے کچھ حاصل نہیں۔ طلوع اسلام کی کوئی جماعت نہیں۔ یہ جماعت سازی کے مسلک ہی کے خلاف ہے۔ نہ ہی یہ موجودہ اربابِ اقتدار کا وکیل ہے۔ ان کی مخالفت (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) خود اس سے ظاہر ہے کہ چراغِ راہ کے قیادت نمبر میں طلوع اسلام میں شائع شدہ مضمون شامل ہے۔ لہٰذا آپ ذرا حقائق کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ کس حد تک درست ہے۔

اب اس سے آگے بڑھ کر ایک اور اصول کی طرف آیئے۔ طلوع اسلام نے پچھلے سال لکھا تھا کہ جماعتِ اسلامی کی ٹیکنک بھی وہی ہے جو میرزا غلام احمد صاحب نے اختیار کی تھی۔ میرزا صاحب نے مسلمانوں کی معاشرتی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گنایا اور بتایا کہ وہ اصل اسلام کے حامل نہیں رہے۔ بات بالکل ٹھیک تھی مسلمان اس آواز کی طرف لپکے۔ میرزا صاحب نے جب صالحیت کی

ہر جگہ نفی کر دی تو اس کے بعد اس خلا کو پورا کرنے کیلئے، اثبات میں اپنی ذات کو پیش کر دیا اور کہدیا کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

ہم نے کہا تھا کہ ایک رسولؐ کا یہ مقام ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے یہ کہے کہ یہ سب بتکدہ ہے اور وہ خود مجسم توحید ہو۔ اس لئے کہ رسول، اپنے ماحول کا پیداوار نہیں ہوتا۔ لیکن کسی غیر رسول کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ یہ کہے کہ میرے ماحول کی قیادت غیر صالح ہے اور میری قیادت صالح ہے۔ جماعتِ اسلامی کا یہی دعوےٰ ہے۔ وہ موجودہ قیادت کے نقائص کو بے نقاب کرنے کے بعد علی الاعلان دعوےٰ کرتی ہے کہ

> آج جس نئی قیادت کی ضرورت عوام پاکستان میں محسوس کی جا رہی ہے اس کے بیج مشیتِ الٰہی نے بہت پہلے سے بو رکھے تھے۔ یہ بیج سنگئہ میں پھوٹے اور جماعتِ اسلامی وجود میں آ گئی۔ (قیادت نمبر۔ صلہ)

غور فرمایا آپ نے! جس طرح مرزا صاحب کی قیادت، "مامور من اللہ" تھی، اسی طرح جماعتِ اسلامی کی قیادت کے بیج بھی "مشیتِ ربانی" نے بہت پہلے سے بو رکھے تھے۔

طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ ہمارا پورے کا پورا معاشرہ خراب ہو چکا ہے اور جس قیادت کے ہاتھوں ہم اس درجہ نالاں و گریاں ہیں وہ ہماری ہی آئینہ دار ہے۔ جس قسم کا دودھ ہوگا اسی قسم کی بالائی آئے گی۔ یہ بات نہیں کہ ہمارا معاشرہ صالحین پر مشتمل ہے لیکن یہ سو پچاس مفسدین کہیں باہر سے آ کر ہم پر مسلط ہو گئے ہیں۔ انہیں نکال دو معاشرہ صالح ہو جائے گا۔ یہ تصور ہی غلط ہے۔ ہمارے ہاں سب خراب ہیں۔ جس کے ہاتھ میں جس قدر قوت آتی ہے اسی قدر اس کی خرابی اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ہم سب کے خون میں فساد پیدا ہو چکا ہے۔ ہم میں سے جو گرم چیز کھا لیتا ہے اس کا فساد تو ان پھوڑے بن کر جلد سے باہر نکل آتا ہے۔ باقیوں کا جلد کے اندر رہتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ ہم میں سے صرف ایک گروہ مفسدین کا ہے اور باقی سب صالحین ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی ہمیشہ اپنی "صالح قیادت" کا ذکر کرتی ہے۔ قیادت، ایک مجرد اصطلاح (Abstract Term) ہے، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قیادت، بہر حال افراد ہی پر مشتمل ہوگی، لیکن وہ ان صالحین کا نام نہیں لیتی جن پر یہ قیادت مشتمل ہوگی۔ ان سے کہئے کہ موجودہ غیر صالح قیادت (یعنی ان تمام اربابِ حل و عقد جن کے ہاتھ میں حکومت یا سیاست کی زمام ہے) کی جگہ وہ اپنے ہیں سے جن افراد کو صالح نظامِ حکومت چلانے کا اہل سمجھتی ہے ذرا ان کی فہرست تو شائع کر دے، بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ان افراد کے ذمہ حکومت کا نظم و نسق ہوگا، مسجد کی صفیں لپیٹنے کا کام نہیں ہوگا۔ (یہ الگ بات ہے کہ ضرورت پڑ جائے تو انہیں مسجد کی صفیں لپیٹنے سے بھی عار نہ ہو) اور حکومت کا نظام اس انداز سے چلانا ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے لئے نمونہ بن جائے۔ اس لئے کہ ہم ساری دنیا سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں

کہ اگر کسی خطۂ زمین پر "خدائی حکومت" کا قیام ہوگیا تو وہ خطۂ زمین، جنتِ ارضی بن جائے گا اور ساری دنیا دیکھ لیگی کہ قرآن کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ یہ نتائج ہیں جو آپ کی حکومت کو پیدا کرکے دکھانے ہیں اور اُن قوتوں کی مخالفت کے باوجود پیدا کرکے دکھانے ہیں جن کے عزائم چاند اور مریخ تک پہنچنے کے ہیں۔ یہ باتیں محض جذبات ابھار دینے سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ ان کیلئے بڑی بڑی صلاحیتیں درکار ہیں۔ اگر غیر صالح قیادت کا قائم کردہ نظام ناکام رہا تو یہ "انسانوں" کی ناکامی ہوگی۔ لیکن اگر "صالح قیادت" کا نظام ناکام رہ گیا تو یہ "خدا" کی ناکامی ہوگی، اس لئے کہ ان کا دعویٰ تو خدائی نظامِ حکومت قائم کرنے کا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو جو محض جذبات کی رو میں بہہ جانے کیلئے تیار نہ ہو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ کون سے افراد ہیں جو اس قسم کا نظام قائم کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جماعت مسلمانوں کے انہی مذہب پرستانہ جذبات سے کھیل رہی ہے جن سے اس وقت تک مختلف پیرایوں میں کھیلا جاتا رہا ہے۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے مذہب کا وہ غلط تصور نکالا جائے جس نے انہیں اس طرح سے تباہ کر رکھا ہے۔ اور اس کے بجائے دین کا صحیح تصور ان کے سامنے رکھا جائے۔ لیکن یہ چیز اسلامی جماعت کے بس کی نہیں۔ اسلامی جماعت تو اسی مولویت کی ایک (Modernised Form) ہے جو علت العلل ہے، ان تمام فاسد جراثیم کی جو ساری دنیا کے مسلمانوں کے خون میں حلول کر چکے ہیں۔ اسلئے یہ دین کا صحیح تصور کس طرح پیش کر سکتے ہیں، ان کے نزدیک "حکومتِ الٰہیہ" کا تصور بھی "پیشوائیت کے نظام" (Theocratic Government) سے زیادہ کچھ نہیں، جس میں اقتدار حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا۔ اس نظام میں، دین تو خیر کہیں اور رہا، دنیا بھی تباہ ہو جایا کرتی ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ اس وقت تک کیا ہے اس کا نتیجہ فقط اتنا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں "غیر صالح قیادت" کے متعلق یہ تصور پیدا ہوا ہے کہ وہ داڑھی منڈے مغرب زدہ لوگوں کا طبقہ ہے جو نماز نہیں پڑھتے اور روزے نہیں رکھتے، شراب پیتے ہیں، رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ اور "صالح قیادت" وہ ہے جس میں داڑھی[1] رکھی جاتی ہے، نمازیں پڑھی جاتی ہیں، شراب وغیرہ سے اجتناب

---

[1] ممکن ہے داڑھی کا بار بار تذکرہ آپ کو ناگوار سا گذر رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک صالحیت کا بڑا معیار داڑھی بھی ہے۔ خود ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تمام عمر داڑھی منڈاتے رہے لیکن جب انہیں صالح قیادت کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے داڑھی رکھنا ضروری سمجھا۔ اس سے ان کی ذات پر کسی قسم تنقید مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک صالح ہونے کے لئے داڑھی بڑھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ ہے مذہب کا غلط تصور جس سے جذبات کو اپیل کیا جاتا ہے۔ نہ کہ دین۔

کیا جاتا ہے۔ لیکن انھیں اس کا علم نہیں کہ ابلیس کی نگاہیں کس قدر دور بیں ہوتی ہیں اور اس کے بہروپ کیسے نگاہ فریب۔ وہ غیر صالح قیادت جس کے خلاف آپ اس قدر جہاد کر رہے ہیں، ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔ لیکن جب اس نے اس کی ضرورت سمجھی تو وہ بھی ڈاڑھیاں رکھ لیں گے۔ نمازیں پڑھنے لگ جائیں گے۔ شراب سے احتراز برتیں گے اور پھر آپ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ آپ کے معیارِ قیادت پر پورے اتر جائیں گے۔ یہ محض ہمارا قیاس نہیں۔ ذرا مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر غور کیجئے۔ کتنے دور ایسے گذرے ہیں جن میں قیادت ان تمام علامات کی حامل تھی جنھیں آپ شرطِ صالحیت قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آپ خود ہی کہیئے کہ کیا وہ صالح قیادت تھی؟ اگر وہ صالح قیادت نہیں تھی تو جماعت اسلامی کے فارم ممبری کو پُر کر کے اِن علامات کے توسّم سے تو قیادت صالح نہیں بن جایا کرتی۔

ہم اسلامی جماعت کے ان افراد سے جن کے قالب میں سعید روحیں ہیں، مخلصانہ گذارش کرینگے کہ وہ ان تلخ حقیقتوں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں اور پھر سوچیں کہ کیا اسلامی جماعت صحیح مسلک پر جاری ہے۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ اگر آپ فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں صالح قیادت پیدا ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ ان کے دلوں سے مذہب کا غلط تصور نکال کر دین کا صحیح تصور ان کے سامنے رکھیئے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور وقت طلب ہے۔ اس لئے کہ اس میں جذبات کی ہنگامہ آرائیاں نہیں بلکہ صبر و استقلال کی عزم پیمائیاں ہیں۔ یہ کیلے کا پیڑ نہیں کہ آج لگایا اور چھ ماہ بعد پھل اتارنا شروع کر دیا۔ یہ کھجور کا شجرِ محکم ہے جسے دادا لگاتے اور پوتا پھل کھاتے۔ لیکن کیلے میں پھل صرف ایک مرتبہ آتا ہے۔ دوسرے پھل کیلئے اسے کاٹ دینا پڑتا ہے۔ اور کھجور کا یہ عالم ہے کہ محمد بن قاسم کے ہاتھوں کی لگائی ہوئی کھجوریں آج تک سندھ کے صحراؤں میں ثمربار ہیں۔ اب آپ کے سامنے ہے کہ دونوں راہوں میں سے جونسی راہ چاہیں اختیار کریں۔ وہ جذبات پرستی کی سہل وادی ہے۔ یہ دین کی کٹھن گھاٹی۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرًا و اما کفورًا۔

---

۲) آئندہ انتخابات (مغربی پنجاب)

پنجاب میں انتخابات کا موسم پھر آ رہا ہے اور "غمگسارانِ ملت" کے دماغوں میں پھر سے جنون کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اس کی روک تھام کیلئے، کیمبل پور کے ایڈووکیٹ، سید میر حضرت شاہ صاحب نے ۴۴ صفحہ کا ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس کا نام ہے "آئندہ انتخابات اور رائے دہندگان کا معاشی اور سیاسی ماحول"۔ یہ پمفلٹ ناظم قومی دارالکتب و دارالمطالعہ کیمبل پور سے ۸ ریں مل سکتا ہے۔ اگر طلوعِ اسلام میں توفیق ہوتی تو وہ اس مفید پمفلٹ کے کم از کم ایک لاکھ نسخے مفت تقسیم کرنے کا انتظام کرتا۔ لیکن اب اس کی اپنے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس پمفلٹ کے جتنے نسخے منگا سکتے ہیں منگا کر اپنے حلقۂ اثر میں مفت تقسیم کریں۔

قرآن، اُن انسان نما درندوں کو، جن کے منہ کو آدمی کا نمکین خون لگ جاتا ہے، "مترفین" کی جماع

اصطلاح سے پکارتا ہے۔ ان میں ہر وہ ملعون گروہ شامل ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ پیرہن ان کے مختلف ہوتے ہیں لیکن روحِ ابلیسی ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے۔ فرعونیت (بادشاہت) یا اس کے جانشین دورِ حاضر کے جمہوری قباؤں میں چھپے ہوئے مستبدین ہامانیت، یا اسلامی لیبل لگانے والی ملائیت اور پیریت، قارونیت یا عصرِ رواں کے جاگیردار خوانین، زمیندار، کارخانہ دار وغیرہ۔ یہ سب مترفین ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو انتخابی موسم پر راہنمایانِ قوم کے بنگاہ فریب پردوں میں آتا ہے اور عوام کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے نمائندوں کی حیثیت سے اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتا ہے اور جب تک یہ تمکن قائم رہتا ہے، یہ انہی لوگوں کا خون چوسنے میں مصروف رہتا ہے جن کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔ میر حضرت شاہ صاحب نے اس مختصر سے پمفلٹ میں اسی گروہ کی نقاب کشائی کی ہے اور ٹھوس واقعات اور اعداد و شمار سے بتایا ہے کہ یہ غارتگرانِ متاعِ ملت کس بری طرح اس غریب قوم کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے پنجاب مسلم لیگ کے آفس سکرٹری سید ذاکر حسین شہدی کی شہادت کا وہ حصہ بھی نقل کیا ہے جس میں سید صاحب نے عدالت میں بتایا تھا کہ پنجاب مسلم لیگ نے سابقہ انتخابات میں اپنے امیدواروں یا ان کے ایجنٹوں کو کس قدر رقوم انتخاب کے سلسلہ میں دیں۔ یہ تفصیل اس قابل ہے کہ اسے یہاں درج کر دیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے:

تاریخ	نام متعلقہ	رقم
۲۱ رنومبر ۱۹۴۵ء	نواب اللہ یار خاں دولتانہ (میلسی دیہاتی)	۵ ہزار
۴ رجنوری ۱۹۴۶ء	چوہدری غلام فرید (گورداسپور شرقی دیہاتی)	۵ ہزار
۴ر " "	سردار محمد حسین (چونیاں دیہاتی)	۱۰ ہزار
۱۶ر " "	رانا نصر اللہ خاں (ہوشیارپور مغربی دیہاتی)	۱۰ ہزار
۱۶ر " "	عبدالستار خاں نیازی (میانوالی شمالی)	۱۰ ہزار
۱۶ر " "	چوہدری نصر اللہ خاں (امرتسر دیہاتی)	۵ ہزار
۱۸ر " "	راجہ سید اکبر خان (گوجر خاں دیہاتی)	۷ ہزار
۱۸ر " "	سردار بہادر خاں (ڈیرہ غازی خاں جنوبی)	۵ ہزار
۱۹ر " "	سید بہاء الدین (بٹالہ دیہاتی)	۳ ہزار
۱۹ر " "	اکرم علی خاں (ترنتارن دیہاتی)	۱۰ ہزار
۱۹ر " "	چودھری محمد حسین (انبالہ)	۸ ہزار
۱۹ر " "	محمد خورشید علی خاں (رہتک دیہاتی)	۸ ہزار
۱۹ر " "	شیخ محمد یوسف (اٹک جنوبی)	۱۰ ہزار
۲۱ر " "	چودھری عزیز الدین (لائلپور دیہاتی)	۷ ہزار
۲۱ر " "	سردار رشید احمد (لاہور دیہاتی)	۲۵ ہزار
۲۱ر " "	چوہدری نصیر الدین (سیالکوٹ شمالی دیہاتی)	۵ ہزار

تاریخ	نام	رقم
۲۱ر جنوری ۱۹۴۶ء	محمد یوسف (اٹک جنوبی)	۵ ہزار
۲۸ر " "	سردار احمد جان (گوڑگانوں شمال مغربی دیہاتی)	۵ ہزار
۲۸ر " "	امیر عبداللہ خاں (میانوالی جنوبی)	۳ ہزار
۲۸ر " "	سردار محمد حسین (چونیاں دیہاتی)	۵ ہزار
۲۸ر " "	عبدالغفور قمر (شکرگڑھ دیہاتی)	۷ ہزار
۲۸ر " "	ولی محمد (جالندھر جنوبی دیہاتی)	۵ ہزار
۲۸ر " "	چودہری نصراللہ خاں (امرتسر دیہاتی)	۲ ہزار
۲۸ " "	سردار ممتاز علی خاں (اٹک شمالی)	۵ ہزار
۲۸ " "	راجہ غضنفر علی خاں (پنڈدادنخاں دیہاتی)	۱۷ ہزار ۸ سو
۲۸ " "	چودہری محمد حسین (انبالہ)	۱۰ ہزار
۲۸ " "	سردار ممتاز علی خاں (اٹک شمالی)	۵ ہزار
۲۹ " "	چودہری عزیزالدین (لائل پور دیہاتی)	۵ ہزار
۲۹ " "	چودہری محمد حسین (انبالہ)	۸ ہزار
۲۹ " "	محمد خورشید علی خاں (رہتک دیہاتی)	۸ ہزار
۲۹ " "	راجہ سید اکبر خاں (گوجرخاں دیہاتی)	۳ ہزار
۲۹ " "	چودہری صاحبداد خاں (حصار دیہاتی)	۵ ہزار
۲۹ " "	چودہری نصراللہ خاں (امرتسر دیہاتی)	۴ ہزار
۲۹ " "	چودہری ظفراللہ خاں (اجنالہ دیہاتی) (لکھپتی سوم نمبر)	۵ ہزار
۳۰ " "	سردار بہادر خاں دریشک (ڈیرہ غازیخاں) لینڈ لارڈ ریٹائرڈ اکسٹرا اسسٹنٹ (؟)	۵ ہزار
	میزان	۲,۲۳,۰۰۰

ایجنٹوں کی رقمیں

یہ تو ہوئے وہ امیدواران کرام جنہوں نے اچھے خاصے دولتمند اور الیکشن باز ہونے کے باوجود مسلم لیگ سے ہزاروں روپے وصول کئے۔ اب ان حضرات میں سے بعض ایجنٹوں کی فتوحات ملاحظہ ہوں:

تاریخ	نام ایجنٹ	رقم
۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء	عبداللہ شاہ قریشی سرگودھا	۵ ہزار
۱۵ " "	محمد جہانگیر ایڈووکیٹ ایجنٹ نواب ممدوٹ	۱۰ ہزار ۳۶ روپے
۱۹ر جنوری ۱۹۴۶ء	چودہری محمد شریف اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل	۵ ہزار
۲۱ " "	محمد سعید قریشی (خلف نواب محمد حیات قریشی)	۱۵ ہزار
۲۱ " "	ملک عبدالعزیز (گورداسپور)	۱۲ ہزار
۲۸ " "	سید محمد کامل	۵ ہزار

(نوٹ: ہم نے یہ اعداد و شمار بجنسہٖ نقل کر دیے ہیں۔ میزانوں کی غلطیاں درست نہیں کیں۔ طلوع اسلام)

۲۸ رجنوری ۱۹۴۶ء سید محمد شریف اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل گوجرانوالہ ۵ ہزار

۲۹ ″ ″ میاں عبدالباری (لائلپور) ۴ ہزار

۲۹ ″ ″ چوہدری رحمت اللہ (برائے محمد رفیق صاحب لاہور بیرون شہر) ۳ ہزار

میزان ۷۱،۰۳۶

ریڈیو سیٹ، لاؤڈ سپیکر و لاریاں وغیرہ

۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء	ریڈیو سیٹ خریدے گئے	۱۰ ہزار	۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء	آٹھ سیٹ ایمپلیفائر	۱۰ ہزار
۱۵ر ″ ″	ریڈیو سیٹ خریدے گئے	۷ ہزار ایک سو پچاس	۸ر دسمبر ۱۹۴۵ء	کو مزید ریڈیو سیٹ	ایک ہزار چار سو

میزان ۲۸،۵۸۵

دوران انتخاب میں لاریوں کا کرایہ (۲،۶۴،۰۰۰ روپے) پولنگ بکسوں کی مہریں بنوائی گئیں (۷،۰۵۲ روپے) محمد شریف فریکوٹ ٹرانسپورٹ کو لاریوں کا کرایہ (یہ لاریاں نواب ممدوٹ کے حلقہ میں استعمال کی گئیں) (اکیس ہزار روپے) میزان ۲،۹۲،۰۵۲

آخری گوشوارہ: براہ راست دیا گیا (امیدواروں کو) (۲،۳۲،۰۰۰ روپے) لاریاں اور مہریں (۲،۹۲،۰۵۲ روپے) ریڈیو سیٹ لاؤڈ سپیکر (۲۸،۵۸۵ روپے) ایجنٹوں کو (۷۱،۰۳۶) میزان کل ۶،۲۳،۶۷۳

میر صاحب نے اس قسم کے واقعات اور اعداد و شمار کے اظہار کے بعد عام ووٹروں سے کہا ہے کہ وہ سوچیں کہ یہ "راہنمایان قوم" ان کی نمائندگی کے اہل کس طرح سے ہو سکتے ہیں؟

تشخیص تو میر صاحب نے بالکل درست کی ہے لیکن سوال پھر وہی سامنے آجاتا ہے کہ "پس چہ باید کرد؟" اس کا علاج انہوں نے یہ بتایا ہے کہ

> اگر مغربی پنجاب کے تمام مزارعے اور چھوٹے مالک ایسے ممبروں کو منتخب کریں جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اور ایسے ممبروں کی مجلس قانون ساز میں کثرت آجائے تو ان کو دستوری حق حاصل ہے کہ وہ ایسا قانون بنائیں جو ان کے خیال میں بہترین ہے اور عوام کے فائدے کیلئے ہے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ "مزارعے اور چھوٹے مالک" جو تمام کے تمام بیچارے اپنی روٹی تک کے لئے محتاج ہیں، ان قانون سازوں کا مقابلہ کس طرح سے کریں؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کا عملی حل اس پمفلٹ میں نہیں دیا گیا۔ ہم میر صاحب سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ اس مشکل کا کوئی عملی حل سوچ سکتے ہیں تو اسے سامنے لائیں۔ طلوع اسلام اپنی بے مائیگی کے باوجود اتنا کر سکتا ہے کہ اس حل کو (بشرطیکہ وہ اطمینان بخش عملی حل ہو) اپنے ہاں شائع کر دے اور اس مضمون کے دو ہزار پمفلٹ مفت تقسیم کے لئے میر صاحب کی خدمت میں پیش کر دے۔